ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
بوجہ اضافۂ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

نگار

ہمیشہ یاد رکھئے کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینے کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گُنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنے ۸؍ کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

جلد (۳۸) | فہرست مضامین ستمبر ۱۹۴۰ء | شمار (۳)

ملاحظات ---------- ۲
بعض حیرتناک سیاسی انکشافات ---------- محمد عتیق صدیقی ---------- ۹
ہندوستان (فسانہ) ---------- نوابزادہ راحت سعید خاں بی۔ اے ---------- ۲۰
اُس لڑائی کے بعد اور اِس لڑائی سے پہلے ---------- ۲۴
کرن اور کنتی ---------- سید اصغر علی ---------- ۳۱
ہندستانی اور اُردو دونوں ایک ہیں ---------- پروفیسر رشید احمد صدیقی ---------- ۳۴
باب الاستفسار ---------- ۵۲
مکتوبات نیاز ---------- ۵۵
"قرآن" نام اس کے مفہوم کا ہے نہ کہ الفاظ کا ---------- طالب صفوی ---------- ۵۷
جنگ پر جانے والے جہاز میں ---------- انور ---------- ۶۱
اڈیٹر "نگار" اور کلام اللہ ---------- (پروفیسر) نواب علی (ایم۔ اے) ---------- ۶۶
منظومات ---------- ماہر القادری، فانی، سروش، نبی احمد، کاوش ---------- ۷۱

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد-۳۸	ستمبر سنہ ۶۰ء	شمارہ-۳

ملاحظات

جنوری سنہ ۶۱ء کا "نگار" کیا ہوگا

اس کے متعلق خلاف معمول زیادہ تاخیر کے ساتھ اطلاع دیجا رہی ہے۔ متعدد موضوع سامنے تھے لیکن آخر کار فیصلہ یہ قرار پایا کہ

جنوری سنہ ۶۱ء کا "نگار"

عہد حاضر کے اکابر شعراء اور اچھے غزلگو حضرات کے لئے وقف ہو لیکن اس خصوصیت کے ساتھ کہ وہ خود اپنے کلام کا انتخاب مرحمت فرمائیں۔

ساتھ ہی ساتھ ان کے مختصر حالات بھی دئے جائیں گے اور ممکن ہوا تو تصویر بھی۔

ہر شاعر کے کلام کے بعد ایک مختصر سا نوٹ میرا ہوگا جسے "خیر مقدمانہ تعارف" سمجھنا چاہئے۔

اس وقت تک جتنے تذکرے مرتب ہوئے ہیں ان میں انتخاب کلام کے متعلق یہ بحث ہو سکتی تھی کہ ممکن ہے

تذکرہ نویس نے اچھے اشعار چھوڑ دئے ہوں یا اس کا ذوق سخن پاکیزہ نہ رہا ہو۔

اس تذکرہ میں اس بحث کی کوئی گنجایش نہ ہوگی اور غالباً اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ پہلا تذکرہ ہوگا جس کی قیمت کا صحیح اندازہ آج نہیں، نصف صدی گزرنے کے بعد ہو سکے گا۔

جن جن شعراء کو شرکت کی زحمت دی گئی ہے، ان کی فہرست آیندہ اشاعت میں ملاحظہ فرمائیے گا۔ کوشش کی جائے گی کہ یہ سالنامہ اپنے موضوع کے لحاظ سے ہر طرح مکمل ہو۔

قرآن مجید کی بحث ختم

قرآن مجید کے کلام الہی ہونے کے متعلق میری جو ذاتی رائے تھی اسے ظاہر کر چکا ہوں۔ یعنی یہ کہ میں اس کے الفاظ کو انسانی الفاظ سمجھتا ہوں، لیکن مفہوم کے لحاظ سے اُسے وحی، الہام، اشارۂ غیبی یا اصلاح قومی کے زبردست جذبۂ فطری کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔

میں نے جو عقلی شبہات پیش کئے تھے ان کا جواب دینے کی زحمت صرف ایک صاحب مولانا ابوصلاح صمدانی مصطفےٰ آبادی نے گوارا فرمائی، لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ "قرآن سے مراد اصل معنی و مطلب قرآن ہے، الفاظ یا زبان عربی خدا کا کلام نہیں"۔ اس لئے میرے ان کے درمیان کوئی اختلاف باقی نہیں رہا، انھوں نے قرآن کو ایک جگہ علم الہی سے بھی تعبیر کیا ہے، جس سے مجھے کیا، کسی کو بھی اعتراض نہیں ہو سکتا، کیونکہ قرآن کیا ساری کائنات علم الہی میں داخل ہے۔ اب رہا یہ کہ علم الہی سے ان کی کیا مراد ہے اور موجودہ زمانہ کے اہل علم اسے کیا سمجھتے ہیں، یہ دوسری بحث ہے جس کے چھیڑنے کی فی الحال ضرورت نہیں۔ بہرحال میری طرف سے یہ بحث و گفتگو ختم ہوتی ہے اس لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اور حضرات بھی اب اس موضوع پر کوئی ایسا مقالہ میرے پاس بھیجنے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں، جس میں محض روایات یا اسلامی لٹریچر سے مدد لی گئی ہو، عقلی اعتراضات کا جواب منقولات سے دینا انتہائی کمزوری ہے۔

جنگ کا ایک سال

جنگ کے آغاز کو آج یکم ستمبر تک پورا ایک سال ہو چکا ہے اور گو دنیا جہاں پہلے تھی اسی جگہ اب بھی نظر آتی ہے، لیکن سچ پوچھئے تو وہ بہت کچھ اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہے۔

ہم ہندوستان میں ہیں، جہاں ہم کو دونوں وقت بُرے بھلے کسی نہ کسی طرح روٹی مل رہی ہے، جہاں ہم آزادی کے ساتھ چل پھر رہے ہیں اور اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں، لیکن جنگ کیا چیز ہے اور اس ایکسال میں اس نے کیا سے کیا کر دیا اس کا حال آپ یورپ میں جا کر دیکھئے، جو آگ کی بھٹی بنا ہوا ہے اور جہاں اس بھٹی میں اسوقت تک ایک درجن سے زیادہ سلطنتوں کو جھونکا جا چکا ہے اور معلوم نہیں آیندہ کن کن ملکوں کے ساتھ یہی سلوک ہونا ہے۔

آسٹریا، حبشہ، البانیہ، زیکوسلیوکیا، پولینڈ، لٹویا، استھونیا، لتھونیا، فن لینڈ، ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ، بلجیم اور فرانس، گویا چودہ حکومتیں اس وقت تک تباہ ہو کر جرمنی، روس اور اٹلی کے زیر اثر آچکی ہیں اور اگر یہ سب کچھ خلافِ حق و انصاف ہوا ہے تو اس میں شک نہیں کہ قدرت نے شاید سب سے پہلی مرتبہ اتنی بڑی ناانصافی و حق تلفی کو گوارا کیا ہو۔ تقریباً ۱۲ لاکھ مربع میل زمین اور اس پر تیرہ کروڑ سے زیادہ بسنے والی آبادی کی قسمتوں کا دفعتاً یوں پلٹ جانا کوئی تماشہ نہیں ہے، لیکن ہم نے یہ سب کچھ دیکھا اور ابھی اور دیکھنے کی تمنا ہے۔ سچ ہے انسان سے زیادہ متحمل اور تماشہ پسند مخلوق دنیا میں اور کوئی نہیں!

یوں تو گزشتہ جنگ کے بعد ہی سے یوروپ کی حالت ایسی تھی کہ اسے نہ زمانۂ جنگ کہہ سکتے تھے نہ عہدِ امن و سکون، لیکن یہ دورِ تذبذب کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتا تھا کہ آخرکار ۲۱ اگست سنہ ۳۹ء کو ماسکو کی اس خبر نے کہ روس و جرمنی کے درمیان معاہدۂ اتحاد ہو گیا ہے، دنیا کو چونکا دیا اور لوگ سمجھ گئے کہ اب یہ طوفان آئے بغیر نہ رہے گا۔

اس وقت تک یوروپ کی سیاسی حالت بالکل ایسی تھی جیسے نظامِ شمسی کے مختلف کُرے مختلف سمت کی کششوں کی وجہ سے اپنی اپنی جگہ قایم رہتے ہیں۔ ایک طرف روس و فرانس کا اتحاد تھا اور دوسری طرف اٹلی و جرمنی کی دوستی۔ یہ گویا برابر کی کشش تھی جس نے کسی ملک کو اپنی جگہ سے ہٹنے نہ دیا، لیکن جب جرمنی نے روس کو اپنی طرف ملا لیا (جسے ربن ٹراپ کی سب سے بڑی سیاسی کامیابی کہا جاتا ہے) تو یہ کشش ایک طرف سے ڈھیلی ہو گئی اور جرمنی نے یکم ستمبر کو تین طرف سے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ چونکہ اب حالات بہت بدل گئے تھے، اس لئے برطانیہ و فرانس کو بھی اپنی امن پسند پالیسی ختم کر دینا پڑی اور ۳ ستمبر کو انھوں نے بھی پولینڈ کی حمایت میں اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس اعلان سے یقیناً پولینڈ کو کوئی فایدہ نہیں پہونچا، کیونکہ جرمنی درمیان میں حایل تھا اور فرانس و برطانیہ اپنی فوجیں وہاں بھیج نہ سکتے تھے، لیکن اگر اس کا امکان ہوتا تو بھی اس کے لئے کچھ وقت چاہئے تھا اور بدقسمتی سے پولینڈ اتحادیین کے ایفاءِ عہد تک زندہ نہ رہ سکا۔ پولینڈ دنیا کی پانچویں قوت تسلیم کیا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ اس کی ۴۰ لاکھ بہادر فوج جدید ترین اسلحہ سے آراستہ ہے، لیکن پندرہ دن کے اندر اس کی لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اور پُر رونق آبادیاں خاک میں مل گئیں اور جرمنی و روس نے اسے آپس میں تقسیم کر لیا۔ فرانس و برطانیہ نے اعلانِ جنگ کے ساتھ ہی فرانس کی سرحد پر فوجوں کا اجتماع شروع کر دیا اور سیگفرڈ لائن کی طرف بڑھنے کی کوشش بھی کی، کیونکہ پولینڈ کے بعد نازی افواج کو اصولاً فرانس ہی کی طرف سے بڑھنا چاہئے تھا، لیکن ہٹلر نے پولینڈ فتح کر لینے کے بعد کوشش کی کہ فرانس و برطانیہ سے صلح ہو جائے، لیکن اس میں وہ ناکام رہا۔ اب جاڑوں کی بارش شروع ہو گئی تھی اور عملی حیثیت سے جنگ کا جاری رکھنا دشوار تھا اس لئے فرانسیسی فوجیں بھی پیچھے ہٹ آئیں اور میزنو لائن پر مورچہ بند ہو گئیں۔ اس وقت جنگ کی صورت صرف یہ تھی کہ جرمن آبدوز کشتیاں اِدھر اُدھر تجارتی جہازوں پر حملہ کر رہی تھیں اور برطانیہ جرمنی کی ناکہ بندی میں مصروف تھا۔ ہوائی حملہ کی دھمکیاں ہٹلر کی طرف سے بار بار دی گئیں لیکن حملہ کوئی نہیں ہوا۔ اس دوران میں برطانوی پالیسی کو سب سے بڑی کامیابی یہ ہوئی کہ روس و ترکی کے درمیان معاہدۂ اتحاد کی گفتگو ختم ہو گئی اور فرانس و برطانیہ نے ترکی کو اپنی طرف کر لیا۔ دوسرا اہم واقعہ یہ ہوا کہ امریکہ نے اپنے قانون غیر جانبداری میں

ترمیم کرکے نقد قیمت پر سامان جنگ فراہم کرنے کا فیصلہ کیا - اس سے برطانیہ کو بہت تقویت پہونچی کیونکہ اس مالی و اقتصادی مقابلہ میں جرمنی، برطانیہ کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا - اٹلی کی حیثیت بالکل ایک غیر جانبدار حکومت کی سی تھی اور روس و جرمن اتحاد اس کی نگاہوں میں کھٹک رہا تھا -

فتح پولینڈ کے بعد پورے تین مہینے گزر جاتے ہیں اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ آئندہ کیا ہونا ہے - لیکن یہی گومگو کا عالم سخت قسم کی اعصابی بے چینی سارے یوروپ میں پھیلا دیتا ہے اور کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ اب آگ کے شعلے کس کونہ سے بھڑکیں گے -

فرانسیسی فوجیں جرمن سرحد کی طرف پانسو مربع میل کے رقبہ پر قبضہ کر چکی تھیں لیکن بارش و سردی کی وجہ سے وہ بھی پیچھے ہٹ آئی ہیں اور میزنو لائن پر جمع ہیں - ہوائی حملے البتہ کبھی کبھی ہوتے رہتے ہیں، سمندر میں آبدوز کشتیاں بھی تارپیڈو سر کرتی رہتی ہیں، رود بار انگلستان میں سرنگیں بھی بچھائی اور ہٹائی جا رہی ہیں، لیکن یہ سب کچھ اس طرح ہو رہا ہے، گو فرصت کی تفریحیں ہیں -

روس البتہ اس دوران میں خاموش نہیں رہا، پہلے تو اس نے بالٹک کی ریاستوں (لتھونیا، اسٹونیا اور لیٹویا) کو دھمکا کر خاص خاص رعایتیں ان سے حاصل کر لیں، اور پھر فنلینڈ پر حملہ کر دیا کیونکہ وہ روس کے مطالبات ماننے کے لئے طیار نہ تھا - ہر چند روس و فنلینڈ کا مقابلہ ہی کیا، لیکن سردی اور برفباری کی شدت فنلینڈ کا ساتھ دے رہی ہے اور روس کو بڑی مشکل پڑ رہی ہے -

وسط یوروپ میں بلقان کی طرف رومانیا کا مسئلہ اُلجھتا نظر آتا ہے، روس و جرمن دونوں اپنے اثرات وہاں قایم کرنا چاہتے ہیں، لیکن کھل کر کوئی بات نہیں کی جاتی - مغرب کی طرف صرف بحری سرنگوں اور آبدوز کشتیوں کی جنگ جاری ہے اور برطانیہ سختی کے ساتھ جرمنی میں مال کی درآمد برآمد بند کر رہا ہے -

لڑائی کو چار مہینے گزر چکے ہیں، فنلینڈ میں جنگ جاری ہے، جرمنی نے ابتک کوئی ہوائی حملہ نہیں کیا، لیکن مقناطیسی سرنگیں بچھا کر برطانیہ کے جہازوں کو نقصان پہونچانے کی کوشش کر رہا ہے --- برطانیہ کو اسوقت تک تین فی صدی سے زیادہ نقصان پہونچا برخلاف اس کے جرمن آبدوز کشتیوں اور تجارتی و جنگی جہازوں کا نقصان زیادہ ہوا -

جنیوا میں لیگ اقوام کا جلسہ ہوتا ہے جس میں ۴۲ حکومتیں روس کے خلاف رائے دیتی ہیں اور روس کو حملۂ فن لینڈ کی وجہ سے لیگ سے علٰحدہ کر دیا جاتا ہے - ہٹلر نے اس زمانہ میں ایک کوشش یہ کی کہ فرانس کو برطانیہ کی طرف سے بدظن کر دے اور صلح کی کوئی صورت پیدا ہو جائے، لیکن کامیابی نہ ہوئی، لیکن برطانیہ نے جو اربوں پونڈ لڑائی کے لئے منظور کر چکا ہے، ہٹلر کو یقین دلا دیا کہ اب برطانیہ اسوقت تک صلح نہ کرے گا جب تک اِدھر یا اُدھر کوئی فیصلہ نہ ہو جائے -

---

ساڑھے تین مہینے کے بعد فنلینڈ کی لڑائی ختم ہوتی ہے - فنلینڈ نے جس جرأت سے روس کا مقابلہ کیا وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، لیکن جاڑا کم ہوتے ہی روس نے بیشمار فوجیں منرہیم لائن پر اکٹھا کر دیں اور ہزاروں جہازوں سے بمباری کرکے فن لینڈ کو صلح پر مجبور کر دیا -

۲۶ر فروری کو فرانس و برطانیہ نے فنلینڈ کو لکھا تھا کہ وہ سامان جنگ اور فوج بھیجنے کے لئے طیار ہیں لیکن ۷ر مارچ تک اس کا کوئی جواب نہ ملا کیونکہ سویڈن اور ناروے اپنے حدود سے برطانوی فوجوں کے گزرنے کی اجازت نہ دیتے تھے اور اس طرح فنلینڈ صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔ تاہم فرانس و برطانیہ نے تین مہینے کے اندر ۵۰۰ ہوائی جہاز، ۹۱۲ توپیں، ۲۵ لاکھ گولے، ۵۰۰۰ مشین گنیں، ساڑھے چار لاکھ بم اور ۶ کروڑ کارتوس فنلینڈ کو فراہم کئے۔

روس و فنلینڈ کی صلح کے بعد جرمنی کا وزیر خارجہ ربن ٹراپ روم گیا اور مسولینی اور کونٹ چیانو سے کچھ بات چیت کی، پھر خود ہٹلر اور مسولینی درۂ برینر کے قریب ملے۔ اس ملاقات کا مقصود غالباً یہ تھا کہ بلقان کے مسئلہ میں اطالیہ اور روس کے اختلاف کو مٹا کر آپس میں معاہدۂ اتحاد کرا دیا جائے۔ اسی زمانہ میں فرانس کی وزارت میں بھی تبدیلی ہوئی اور برطانوی کیبنٹ میں بھی ردو بدل کی خبریں آنے لگیں، کیونکہ اب بجائے مدافعت کے جارحانہ کارروائی کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔

لڑائی کو آٹھواں مہینہ شروع ہے جسے عورتیں ان گنا مہینہ کہتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ مہینہ بہت منحوس ثابت ہوا، کیونکہ جرمنی نے بغیر کسی اطلاع یا الٹی میٹم کے ناگہاں ۹ر اپریل سنہ ۳۹ء کو ڈنمارک اور ناروے کے ساحلی مقامات پر قبضہ کا اعلان کر دیا۔ اس نے بہانہ تو یہ کیا کہ اتحادیین ان ملکوں کے چاروں طرف سرنگیں بچھا کر ان کی غیر جانبداری کو صدمہ پہونچانا چاہتے تھے لیکن اصل سبب یہ تھا کہ جرمنی کو لوہے کی سخت ضرورت تھی وہ سویڈن کے لوہے پر قابض ہو کر ناروے کی بندرگاہ ناروک سے لیے اپنے ملک میں لانا چاہتا تھا۔ ڈنمارک نے تو جرمنی کے اس قبضہ کو تسلیم کر لیا، لیکن ناروے لڑتا رہا اور برطانیہ نے بھی اس کی مدد کے لئے تقریباً ایک لاکھ فوج روانہ کر دی۔ اسی کے ساتھ ڈنمارک اور ناروے کی چاروں طرف سرنگیں بچھا دی گئیں تاکہ جرمن افواج کو کسی طرح کی کمک نہ پہونچ سکے، لیکن چونکہ جرمنی پہلے ہی تمام اہم مقامات پر قبضہ کر چکا تھا اس لئے جرمنی کو ناروے سے نہ ہٹایا جا سکا۔ اس واقعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر چیمبرلین کی وزارت کو استعفا دینا پڑا اور مسٹر چرچل وزیر اعظم ہو گئے، گویا پارٹی گورنمنٹ کے بجائے وہاں قومی حکومت قایم ہو گئی۔ وزارت کی اس تبدیلی نے برطانیہ میں نئی روح پھونک دی اور ایک نیا جوش لڑائی کا ملک میں پیدا ہو گیا لیکن ٹھیک اس وقت جبکہ برطانیہ و فرانس کی حکومتوں میں ردو بدل ہو رہا تھا، ہٹلر نے ۱۰ر مئی کو ہالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ پر اچانک حملہ کر دیا اور وجہ یہ ظاہر کی کہ برطانیہ و فرانس کی فوجیں ان ملکوں سے ہو کر جرمنی پر حملہ کرنا چاہتی تھیں۔ اس حملہ کے ہوتے ہی فرانس و برطانیہ نے مدد دینے کا اعلان کر دیا، لیکن یہ حملہ اس قدر اچانک اور تیز تھا کہ ہالینڈ کو دم لینے کا موقعہ نہ ملا اور اس نے ہتھیار ڈال دئے۔ بلجیم نے بیشک اتحادی افواج کی مدد سے کافی مقابلہ کیا، لیکن جرمنی کا یہ حملہ اتنا زبردست تھا کہ ایک ہفتہ کے اندر ہی بلجیم کے پایۂ تخت بروسلز پر اس کا قبضہ ہو گیا اور شاہ بلجیم آسٹنڈ چلے گئے، یہاں اتحادی افواج بھی تعداد میں پہونچ گئی تھیں اور نہایت ستعدی سے نازی افواج کو آگے بڑھنے سے روکا جا رہا تھا، لیکن شاہ بلجیم نے اپنی فوجوں کو ہتھیار ڈال دینے کا حکم دیدیا۔ اس طرح دفعتاً ۵ لاکھ فوجوں کا لڑائی سے ہاتھ کھینچ لینا ایسی معمولی بات نہ تھی کہ اتحادی افواج اس سے متاثر نہ ہوتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نازی افواج ایک طرف حدود فرانس میں داخل ہو گئیں اور دوسری طرف سواحل بلجیم پر انھوں نے

دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ اس میں شک نہیں کہ کیلے، آسٹنڈ اور ڈنکرک کی بندرگاہوں کو بچانے کے لئے برطانوی افواج نے بڑی جرأت سے مقابلہ کیا، لیکن چونکہ دشمن کی فوجیں کئی گنا زیادہ تھیں، اس لئے کامیابی نہ ہوئی اور آخر میں مجبور ہو کر ڈنکرک خالی کرنا پڑا۔ اس جنگ میں برطانوی افواج کا باوجود چار طرف سے گھر جانے کے لاکھوں سپاہیوں کا ڈنکرک سے صحیح وسالم واپس لیجانا برطانیہ کی بحری قوت کا بڑا زبردست کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

فرانسیسی افواج کی باگ اس وقت جنرل ویگان کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے یہ دیکھ کر کہ اب جرمن افواج کا رُخ پیرس کی طرف ہوگا ایک زبردست خطِ مدافعت نازی افواج کی راہ میں حائل کر دیا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ خط تارِ عنکبوت ثابت ہوا اور نازی افواج کا سیلاب آتش و آہن بڑھتے بڑھتے پیرس تک پہونچ گیا۔ اب اٹلی نے بھی پھُریری لی اور یہ دیکھ کر فرانس ختم ہی ہوا چاہتا ہے خود بھی خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہوگیا اور فرانس و برطانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ چونکہ فرانس کی حالت بہت نازک ہوگئی تھی اس لئے موسیو رینا کو استعفا دینا پڑا اور مارشل پیتاں وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ انھوں نے جرمنی کو صلح کا پیغام دیدیا، برطانیہ کی وزارت نے اس وقت یہ تجویز پیش کی کہ فرانس و برطانیہ کی متحدہ حکومت بنا کر جرمنی کا مقابلہ کیا جائے لیکن فرانس نے اس کو تسلیم نہ کیا اور آخر کار اس کو اپنی عزت و خودداری ہمیشہ کے لئے کھو دینا پڑی۔

جرمنی کی طرف سے جو شرائطِ صلح پیش کی گئیں ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ فرانس اپنے بحری بیڑے جرمنی کے سپرد کر دیگا اور یہ ایسی شرط تھی کہ اگر پوری ہو جاتی تو ہٹلر آسانی سے انگلستان پر حملہ کر سکتا تھا، لیکن مسٹر چرچل نے فوراً ساحل افریقہ پر بعض فرانسیسی جہازوں کو بیکار کر دیا اور جو پہلے ہی سے سواحل انگلستان پر موجود تھے ان کی نقل و حرکت پر نگرانی قایم کر دی۔ اور تخلیۂ ڈنکرک کے بعد برطانیہ کی یہ دوسری کامیابی تھی جس نے ہٹلر کی بہت سی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

فرانس کے اس معرکہ کے بعد روس نے ریاستہائے بالٹک کو سوویٹ یونین میں شامل کر لیا اور رومانیا سے بسربیا اور شمالی بکووینا کا مطالبہ کرنے لگا چونکہ رومانیا کا بادشاہ اس دوران میں ہٹلر کے زیر اثر آچکا تھا اور ہٹلر بلقان میں جنگ کی آگ کو مشتعل دیکھنا پسند نہیں کرتا اس لئے اس نے بھی رومانیا پر دباؤ ڈالکر بسربیا اور بکووینا کا علاقہ روس کو واپس دلوا دیا۔ لیکن اسی سلسلہ میں دوسری پیچیدگی یہ پیدا ہوگئی کہ بلغاریہ اور ہنگری بھی ڈبروجا اور ٹرانسلوینیا کا مطالبہ کرنے لگے۔

اٹلی نے اعلانِ جنگ کے بعد بحر روم کے بعض برطانوی جزایر اور افریقی مقبوضات پر ہوائی حملے کئے اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے، لیکن چونکہ اس کی فضائی و بحری قوت برطانیہ کے مقابلہ میں بہت کمزور ہے، اس لئے وہ کوئی نقصان نہیں پہونچا سکا، بلکہ خود اس کے افریقی مقبوضات خطرہ میں مبتلا ہیں۔ برطانوی سمالی لینڈ میں بیشک اسے غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی لیکن جب تک نہر سویز اور عدن برطانیہ کے قبضہ میں ہے وہ بحر روم میں برطانوی جہازوں کی آمد و رفت کو نہیں روک سکتا۔

ترکی بدستور برطانیہ کی طرف مایل نظر آتا ہے اور مصر نے صاف صاف کہدیا ہے کہ اگر اٹلی نے اس پر حملہ کیا تو وہ برطانیہ کے ساتھ ملکر اس سے جنگ کرے گا۔ امریکہ روز بروز برطانیہ سے قریب ہوتا جا رہا ہے اور اس کی غیر جانبداری برطانوی اتحاد کی شکل

اختیار کرتی جارہی ہے۔

ایشیا پر اس جنگ کا ابتک کوئی خاص اثر نہیں۔ سوائے اس کے کہ جاپان انڈوچائنا اور ایسٹ انڈیز کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے، لیکن ایک طرف امریکہ اور دوسری طرف سنگاپور کا بحری مرکز اس کو کسی جارحانہ اقدام کی جرأت نہیں دلاتے۔

خود جرمنی و برطانیہ میں فی الحال لڑائی کی صورت یہ ہے کہ دونوں طرف سے ہوائی حملے ہو رہے ہیں، یہاں تک کہ لندن اور برلن بھی فضائی تاخت سے نہیں بچ سکے، لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے حملوں سے ملک فتح نہیں ہوا کرتے۔

اب جاڑے آرہے ہیں اس لئے قدرتاً جنگ سرد پڑ جائے گی اور ہر ملک اپنی قوت بڑھانے کی فکر میں لگ جائے گا لیکن یہ واقعہ ہے کہ گزشتہ چند ماہ میں برطانیہ کی ہوائی طاقت میں حیرتناک اضافہ ہوگیا ہے اور جاڑوں کی فرصت اس کے حق میں اور زیادہ مفید ثابت ہوگی۔

آیندہ گرما میں کیا ہوگا، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ جنگ جتنی زیادہ طویل ہوتی جارہی ہے، ہٹلر کی کامیابی کے امکانات بھی ضعیف ہوتے جارہے ہیں۔

کانگرس اور حکومتِ ہند

وایسرائے اور وزیرِ ہند کی طرف سے کانگرس کے مطالبات کا جو جواب دیا گیا ہے وہ ارباب کانگرس کو پسند نہیں آیا اور انھوں نے اپنی ناپسندیدگی کا اعلان کر دیا ہے۔ کانگرس کا مطالبہ یہ تھا کہ فی الحال ایک ذمہ دار قومی حکومت کی بنیاد قایم کرکے مرکز میں اسی لحاظ سے قومی نیابت کا انتظام ہو جانا چاہئے۔ لیکن حکومتِ ہند موجودہ حالات میں اس مطالبہ کو تسلیم نہیں کر سکتی، کیونکہ معلوم نہیں جنگ کی آیندہ صورت کیا ہو اور اُسے یہاں کے نظام حکومت میں کیا تغیر و تبدل کرنا پڑے۔

بہرحال کانگرس اور حکومت کے تعلقات کشیدہ ہوتے جارہے ہیں اور اگر کانگرس نے عام سول نافرمانی شروع کر دی تو یقیناً ہندوستان میں پھر ہنگامۂ دار و گیر شروع ہو جائے گا، لیکن ہمیں توقع نہیں کہ کانگرس سول نافرمانی کی کوئی ایسی صورت اختیار کرے گی جو حکومت کو تشدد کا موقعہ دے، کیونکہ مسلم لیگ کی روش نے کسی متحدہ محاذ کے قیام کو ناممکن بنا دیا ہے اور جب تک سارا ملک متفقہ طور پر اس تحریک کو کامیاب بنانے پر آمادہ نہ ہو جائے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

بعض حیرتناک سیاسی انکشافات

(بہ سلسلۂ ماہ جولائی)

انقلاب روس اور برطانیہ مسٹر بروس لوک ہارٹ (Bruce Lockhart) جو اُسوقت ماسکو میں برطانوی قونصل جنرل تھے ان کا بیان ہے کہ:-

"ابتدا میں تو اتحادیوں نے کافی جوش و خروش کے ساتھ انقلاب روس کا استقبال کیا مگر وہ بہت جلد چونک پڑے عسکری مشیروں کی رائے کے مطابق اب اُن کی خواہش یہ تھی کہ واقعات پھر پلٹا کھائیں اور جو چیز انقلاب سے قبل جہاں پر تھی وہیں واپس چلی جائے"[1]

"یہ محسوس کرنا بیحد ضروری ہے کہ اول تو یہ انقلاب ابتدا ہی سے عوام الناس کا انقلاب تھا جس پر نہ تو روسی پارلیمنٹ کو کوئی اختیار حاصل تھا اور نہ پڑھے لکھے طبقے کو۔ دوسری اہم چیز یہ تھی کہ یہ انقلاب صرف زمین، روٹی اور امن و صلح کا انقلاب تھا۔ ان تینوں چیزوں میں صلح کو سب سے زیادہ دخل تھا۔ روس کو انقلاب سے بچانے کی صرف ایک ہی شکل تھی اور وہ یہ کہ اس کو علحدہ صلح کر لینے دیا جاتا........ کرنسکی (Kerensky) ابتدا ہی ناکام لڑائی لڑ رہا تھا۔ ایک قوم جو جنگ کی تکان سے چور چور ہو رہی تھی اس کو وہ میدان جنگ کی خندقوں میں ڈھکیل دینا چاہتا تھا۔ اسوقت وہ دو طرف سے گھرا تھا، ایک طرف اشتراکی تھے جو ملک کے گوشہ گوشہ سے صلح کے لئے غلغلہ بلند کر رہے تھے اور دوسری طرف اتحادی طاقتیں جو زار کی طرز کی حکومت کے قیام کے لئے کوشاں تھیں۔"

روس میں اُسوقت دو پارٹیاں تھیں۔ ایک تو کانسٹیٹیوشنل ڈماکریٹ (Constitutional Democrats) ان پر سرمایہ دار جماعتیں حاوی تھیں ان کو کیڈٹ (Cadet) کہتے تھے۔ دوسری پارٹی سوویٹ (Soviet) کی (مزدوروں کی کونسل) تھی اس میں فوج کے سپاہی اور کسان بھی شامل تھے۔ ان کا نعرہ تھا:- "زمین کسانوں کی، کارخانے مزدوروں کے اور طاقت سوویٹ کی۔" کیڈٹ جماعت اس نعرے کی مخالف تھی اُن کو تمام تر بھروسہ اتحادیوں اور جنگ پر تھا۔

---

[1] The Memoirs of a British Agent) صفحہ ۱۰۵۔

اُن دنوں سر جارج بچانان (Sir George Bachanan) پیٹروگرڈ میں (موجودہ لیننگراڈ) برطانوی سفارت کے عہدہ پر مامور تھے۔ جن کو اشتراکیوں سے سخت نفرت تھی۔ ۱۵ مارچ ۱۹۱۷ء کو لائڈ جارج نے حسب ذیل تار روانہ کیا:-

"عنقریب سماجی انقلابیوں اور ڈوما کے ممبروں کے مابین کھلی ہوئی مخالفت شروع ہونے کے امکانات ہیں۔ اول الذکر صلح کے درپے ہے۔ موخرالذکر جنگ کے حق میں ہے .... اگر یہ کامیاب ہوئے تو روس جنگی اعتبار سے تباہ ہو جائے گا۔ برطانوی مزدور لیڈروں سے ڈوما کے مزدور لیڈروں کی حمایت میں ایک پیغام روانہ کرانا مناسب ہے جس میں اُن کیا رول پر اظہار اعتماد ہو ...... اس پیغام میں برطانوی مزدوروں کے اتحاد کا بھی ذکر ہو"

اس مشورہ پر فوراً عمل کیا گیا۔ مسٹر ارتھر ہنڈرسن جو برطانیہ کے کابینۂ جنگ میں مزدوروں کے نمایندے تھے انھوں نے تار کا ایک مسودہ طیار کیا اور روانہ کر دیا گیا مگر اُس کا کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ اُسی زمانہ میں برطانیہ اور فرانس کے مزدور لیڈروں کا ایک وفد روس کے مزدور لیڈروں کے پاس روانہ کیا گیا لیکن یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ سر جارج اپنے ایک تار مورخہ ۳۰ مئی ۱۹۱۷ء میں رقمطراز ہیں:-

"وہ لوگ (انقلابی) ہمارے مزدور وفد کے نمایندوں پر حملے کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ حکومت کے وظیفہ خوار ہیں اور مزدوروں کے حقیقی نمایندے نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے لوگوں سے کس طرح نپٹا جائے۔"

۵ نومبر کو دوسرے انقلاب کی ابتدا ہوئی اور بالشویکوں نے اس کا اعلان کر دیا کہ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ:- "انصاف اور جمہوریت کے اُصول کے مطابق صلح ہو"۔ ۲۰ نومبر اور ۳۰ نومبر کو لینن نے اُن تمام حکومتوں کے سامنے التوائے جنگ کی تجویز پیش کی جو جنگ میں شریک تھیں۔ ۲۷ نومبر کو سوویٹ حکومت کے وزیر جنگ ٹراٹسکی نے اتحادیوں کو اطلاع کی کہ سوویٹ حکومت کی طرف سے التوائے جنگ کی اپیل عنقریب شایع ہونے والی ہے اگر اتحادیوں نے اسکو ٹھکرایا تو سوویٹ حکومت علٰحدہ معاہدہ کرے گی۔ اور پھر اتحادی حکومتوں کی عوام سے اپیل کی جائے گی۔

۲۹ نومبر کو برطانوی کابینۂ جنگ کا جلسہ ہوا جس نے سوویٹ روس کی اپیل اور لینن کی حسب ذیل تجاویز کو بھی مسترد کر دیا:

"(۱) جن علاقوں پر دوران جنگ میں قبضہ کیا گیا ہے اُن کا جبریہ الحاق نہ ہو۔

(۲) جن قوموں نے دوران جنگ میں اپنی آزادی کھوئی ہے اُن کو مکمل آزادی دی جائے۔

(۳) وہ قومیں جو ابتک آزادی کی نعمت سے محروم تھیں ان کی رائے عامہ کو یہ طے کرنے کا حق دیا جائے کہ وہ خود مختار ہونا چاہتی ہیں یا کسی سلطنت کے ساتھ اُن کو ملحق کر دیا جائے۔

(۴) وہ علاقے جہاں مختلف قومیں آباد ہوں وہاں تمام اقلیتوں کے تحفظ کا پورا پورا انتظام کیا جائے۔

(۵) تامان جنگ کا کوئی سوال نہ ہو بلکہ جنگ میں جو کچھ حاصل ہوا اُس کو واپس کیا جائے۔

(۶) نوآبادیاتی اضافہ کا مسئلہ بھی اسی طرز پر طے کیا جائے "

ولسن اور برطانوی مزدور تحریک کی تجاویز صلح بھی انھیں اُصول پر مبنی تھیں، صرف فرق یہ تھا کہ لینن کی تجاویز میں مجلس اقوام کا کوئی ذکر نہ تھا۔ اگر ہماری حکومت واقعتاً ایسی صلح کی خواہشمند ہوتی تو فوراً موقعہ سے فایدہ اُٹھانے کے لئے میدان میں آجاتی اور جرمنی کو سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔

اُس کے بعد حکومت نے ایک قدم اور آگے بڑھایا یعنی اُس نے سوویٹ روس کے خلاف کاسک (Cossack) سرداروں کی حمایت کی پالیسی کا آغاز کیا برطانیہ کا کابینۂ جنگ یہ طے کرچکا تھا کہ "بالشوک روس کو دشمن قرار دینا چاہئے اور ایسا نہ سمجھنا بڑی سخت حماقت ہوگی"۔ لیکن اُس کے ساتھ ہی دوسری طرف اس پالیسی کے بالکل برعکس ایک مسودہ طیار کیا گیا جس میں سوویٹ کے ساتھ اتحادی حکومتوں کی پالیسی کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس مسودہ کو فرانس کی حکومت نے بھی منظور کیا اور اس کو سوویٹ حکومت کے پاس روانہ کردیا گیا۔ اس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ :-

"ہم لوگ روس کی داخلی سیاست میں کسی قسم کا حصہ لینا پسند نہیں کرتے۔ رہ گئی یہ بدگمانی کہ ہم رد انقلاب کی فکر میں ہیں، بالکل غلط ہے۔ یہ خیال جرمنی اور آسٹریا کی مطلق العنان حکومتوں کے لئے ممکن ہے کہ دلکش ہو مگر یورپ کی مغربی جمہوریتوں اور جمہوریہ امریکہ کو اس خیال میں کوئی دلفریبی نظر نہیں آتی"۔

لیکن اس کے بعد صورتیں کچھ ایسی پیدا ہوئیں کہ ایک طرف یوکرین کو از سر نو منظم ہونے کے لئے مالی مدد دی گئی اور دوسری طرف کاسک سرداروں اور قاف کی طاقتوں کو مالی امداد پہونچائی گئی۔ اسی کے ساتھ جاپان کو سائبریا پر حملہ کرنے کا موقعہ دیا گیا۔ لیکن جب یہ تدبیریں کامیاب نہ ہوئیں تو پولینڈ کی طرف نگاہیں گئیں لیکن اس موقعہ پر مزدور تحریک آڑے آگئی اور اُس نے اس لڑائی کا خاتمہ کردیا۔

روس اور مزدور پارٹی التوائے جنگ کے فوراً ہی بعد مزدور پارٹی کی مجلس عاملہ نے دسمبر ۱۹۱۸ء میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ فوراً اس کا اعلان کرے کہ سوویٹ روس کے ساتھ اس کی پالیسی کیا ہوگی؟ حکومت نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

مزدوروں کو اب اس کا پورا احساس تھا کہ اسوقت جو طاقتیں سوویٹ روس لڑائی لڑ رہی ہیں اس میں صرف اشتراکیت اور لینن ہی اُن کا حریف نہیں بلکہ مزدوروں کی بین الاقوامی انجمن بھی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مزدوروں نے عملی اقدامات بھی شروع کردئے۔ گلاسگو (Glasgow) کی ٹریڈ یونین نے ۲۴ گھنٹہ کی عام ہڑتال کا اعلان کردیا اور سڑکوں پر مظاہرے کئے گئے اور عین اُسوقت جبکہ روس پر پولینڈ کا حملہ شباب پر تھا برطانوی سواحل کے اُن مزدوروں نے جہازوں پر سامان حرب بار کرنے سے انکار کردیا جو روس کے خلاف پولینڈ کی امداد کے لئے روانہ کیا جا رہا تھا۔

یہاں تک کہ جہازوں سے سامان حرب اُتروانا پڑا- اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد تمام مزدوروں نے یہ طے کیا کہ وہ کسی ایسے سامان کو ہاتھ نہ لگائیں گے جس کو روس کے خلاف استعمال کرنے کے لئے روانہ کیا جائے گا- اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولینڈ کو اس لڑائی میں شدید ناکامی ہوئی اور سرخ فوجیں وارسا تک پہونچ گئیں- اس موقعہ پر، ۶ اگست کو برطانیہ کے وزیر خارجہ نے سوویٹ حکومت کو اطلاع دی، اگر سُرخ فوجیں اب آگے بڑھیں تو برطانیہ کو روس کے خلاف اعلان جنگ کرنا پڑے گا-

۹ اگست کو برطانیہ کی ٹریڈ یونین کی پارلیمنٹری کمیٹی کا اور مزدور پارٹی کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا اور یہ طے پایا کہ:-

"منظم مزدوروں کی تمام صنعتی قوت اس جنگ کو ناکام کرنے کے لئے صرف کر دیجائے گی" اور تمام متعلقہ مزدور اداروں کو مطلع کیا گیا کہ وہ فوراً اپنے نمایندوں کو لندن کی نیشنل کانفرنس کی شرکت کے لئے روانہ کریں مجوزہ کانفرنس لندن کے سنٹرل ہال میں منعقد ہوئی- کانفرنس نے ایک مجلس منتخب کی تاکہ جب تک سوویٹ حکومت اپنے کو تسلیم نہ کرائے اور دوسری حکومتوں کے ساتھ اس کے تجارتی تعلقات استوار نہ ہو جائیں، وہ کام کرتی رہے- اس صورت حال نے تمام جوش خروش کو سرد کر دیا-

جنگ کا اختتام

حکومتوں نے جس نظام کی بقا کے لئے اس قدر کوشش کی تھی اُس کی بنیادیں ابھی تک متزلزل تھیں- سنہ ۱۷ء اور سنہ ۱۸ء میں جرمنی، انگلستان اور فرانس میں بڑی بڑی ہڑتالیں ہوئیں- جرمنی کی ہڑتال میں کوئی دس لاکھ مزدوروں نے حصہ لیا- فرانس میں فوج کے ایک حصہ میں غدر ہو گیا- اٹلی کی پوری مزدور تحریک جنگ کے خلاف تھی اور اُس نے اپنا رشتہ اشتمالیین کی تیسری بین الاقوامی کانگرس سے جوڑ لیا تھا-

اتحادی طاقتیں انقلاب روس کی طرف بیحد متوجہ تھیں- صلح کانفرنس میں جب وہ جمع ہوتے تو سب سے پہلے انقلاب روس ہی پر تبادلۂ خیال ہوتا- کرنل ہاوس اپنی ڈائری (مورخہ ۲۲ مارچ سنہ ۱۹ء) میں رقمطراز ہیں:-

"بے اطمینانی کی آوازیں فضا میں گونج رہی ہیں- عوام صلح کے خواہشمند ہیں- اشتراکی خیالات ہر جگہ پھیل رہے ہیں ابھی ابھی ہنگری نے دم توڑا ہے- ہم لوگ ایک بارود خانے پر بیٹھے ہیں معلوم نہیں کس دن ایک چنگاری اسکو لے اڑے"

اس سے زیادہ تمثیل انداز بیان مسٹر لائڈ جارج کا اُن کی اُس یادداشت میں محفوظ ہے جو انھوں نے صلح کانفرنس کی "چار بڑی طاقتوں" (Big four) کے سامنے پیش کیا تھا- کہتے ہیں:-

"انقلاب کے یہ تو ایام طفولیت ہیں- خوف و دہشت کی مہیب شکلیں روس میں جا کر دیکھو، تمام یورپ میں انقلابی روح دوڑ رہی ہے- قبل جنگ کے حالات سے مزدور آج صرف غیر مطمئن ہی نہیں بلکہ اُسکے خلاف اس میں غصہ و غضب کی کیفیت پائی جاتی ہے- یورپ میں اس سرے سے لیکر اُس سرے تک موجودہ نظام سیاسی، اقتصادی اور سماجی اعتبار سے نکتہ چینیوں کا مرکز بنا ہے- بعض ممالک مثلاً جرمنی اور روس میں تو اس بے اطمینانی نے انقلاب کی صورت اختیار کر لی ہے، مگر فرانس، برطانیہ اور اٹلی میں وہ ہڑتالوں کی شکل میں نمودار ہوئی ہے- قرائن پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مزدوری کے مطالبہ کے ساتھ ساتھ سماجی تبدیلی کا بھی مطالبہ ہے- اگر اس موقعہ پر ہم نے سنہ ۱۴ء کی طرف واپس جانے کی

کوشش کی تو صلح پائیدار نہ ہوسکے گی اور خطرہ ہے کہیں ہم سارے یورپ کو اُن انتہا پسندوں کی آغوش میں نہ ڈال دیں جو انسان کی تخلیق نو کے لئے موجودہ سماجی نظام کی تبدیلی کو ضروری سمجھتے ہیں۔

روس میں اُن کو کامیابی نصیب ہوئی ہے مگر اس کامیابی کے لئے انھوں نے بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ لاکھوں جانیں تلف ہوئیں، ریل کی پٹریاں، سڑکیں اور شہر تباہ ہوئے، اور روس کا تمام نظام درہم برہم ہوگیا۔

سب سے بڑا خطرہ جس کو اسوقت میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں یہ ہے کہ کہیں جرمنی بھی اسی رنگ میں نہ رنگ جائے اور اپنے تمام ذرائع کہیں ان انقلابی دیوانوں کے حوالہ نہ کردے جو تمام دنیا کو بزور شمشیر اشتراکیت کے لئے فتح کرنا چاہتے ہیں۔ اب یہ خطرہ خواب نہیں ہے"

یہ تھے خطرات، انقلاب روس اور مزدور تحریک سے۔ یہی خطرہ تھا جس نے ان کو مجلس اقوام اور مزدوروں کی بین الاقوامی انجمن کے قیام کے لئے مستعد کردیا۔ اگر یہ صورت حال یورپ میں نہ پیدا ہوجاتی تو اتحادئین روس میں ردانقلاب کی کوشش میں کامیاب ہوجاتے اور پھر اُن کا وہ پروگرام بھی پورا ہوجاتا جس کو انھوں نے اپنے خفیہ معاہدات میں مرتب کیا تھا۔ اسکوئتھ (Asquith) کی وزارت دوران جنگ میں (Power Politics) سے اپنا ناتا توڑ چکی حال

اور یہ اُس کی بڑی غلطی تھی۔ دوران جنگ میں معتدل حکومت نے 'قومی حکومت' کا رنگ اختیار کیا، اس پر غلبہ ہا قدامت پرستوں کا اور یہی وجہ تھی کہ مجلس اقوام کی تشکیل کے بعد بھی (Power Politics) کی طرف واپس جانیکی تڑپ اس میں پائی جاتی تھی اور اس نے مجلس اقوام کو درہم برہم کردیا۔ لائڈ جارج کی قومی حکومت اختتام جنگ کے وقت جس رنگ کی تھی وہی رنگ بعد کی حکومت کا بھی ہے۔ یہ قومی حکومت اور (Power Politics) کا کھیل، اس طرح کھیلا جارہا ہے کہ جب وہ اپنی نوآبادیات کے لئے میدان جنگ میں قدم رکھے گی تو دنیا کو یہ یقین نہ دلاسکے گی کہ وہ اجتماعی تحفظ کے لئے لڑرہی ہے یا جمہوریت کے لئے آنے والی لڑائی میں فرانس اور ممکن ہے کہ کوئی اور ایک آدھ طاقتیں ہمارے ساتھ ہوں مگر یہ یقینی ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور سوویٹ روس کا اتحاد ہم کو ہرگز حاصل نہ ہوگا اسوقت ہمارا مقابلہ تین فسطائی طاقتوں سے ہوگا۔ اس لڑائی میں جیسا کہ مسٹر چمبرلین نے کہا تھا "کوئی فاتح نہ ہوگا" یعنی اس لڑائی کا خاتمہ انقلاب پر ہوگا اور جب ایک ملک میں انقلاب کا طوفان اُٹھیگا تو وہ اپنے ساتھ تمام ملکوں کو بہا کر لیجائیگا۔

۱۹۳۱ء میں جاپان نے منچوریا (Manchuria) پر حملہ کیا۔ ہماری حکومت نے اس پر چشم پوشی کی۔ قومی حکومت کو اس کا تو ضرور احساس تھا کہ جاپان نے چین پر اقدام شروع کردیا ہے مگر اس موقعہ پر امریکہ، مجلس اقوام اور سوویٹ روس کے ساتھ اتحاد کرکے جاپان کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس حکومت نے خاموشی کو بہتر سمجھا کیونکہ چین کی کامیابی کے معنے یہ تھے کہ ایک طرف جاپان میں انقلاب ہو اور دوسری طرف چین میں قومی حکومت کا قیام عمل میں آئے۔ ہماری قومی حکومت نے اپنی جگہ پر یہ پہلے ہی سے طے کرلیا تھا کہ جاپان سے معاملہ طے کرلیا جائے گا اور

جاپان کو اگر منچوریا سے فائدہ اُٹھانے کا موقعہ دیا گیا تو پھر اُس کے معاوضہ میں جاپان، چین کے بقیہ حصہ میں برطانوی مفاد کا احترام ضروری سمجھے گا۔

آج جاپان منچوریا والی لڑائی سے زیادہ بڑی لڑائی لڑ رہا ہے اور ہماری حکومت کا مقصد وہی ہے جو پہلے تھا نیز اُس نے مالیاتی معاہدہ بھی جاپان سے کیا ہے تاکہ ین (Yen جاپانی سکہ) کا توازن برقرار رہے۔ اس سے قطع نظر ایوننگ اسٹینڈرڈ، (Evening Standard) کے نامہ نگار مقیم جاپان نے اپنے مراسلہ مورخہ ۳ جنوری ۳۸ء میں لکھا تھا کہ:

"ٹوکیو (Tokyo) اور لندن کے مابین جو موجودہ کشمکش ہے اس کے باوجود آگے چل کر جاپان، چین میں اپنے وسایل کو مضبوط کرنے کے لئے لندن سے امداد کا طالب ہوگا"

ان حالات کے باوجود جاپان کی طرف سے برطانیہ کو پورا اطمینان نہ تھا چنانچہ اُسنے صرف اس خیال سے کہ مبادا جاپان برطانوی مفاد پر بھی ہاتھ نہ صاف کر دے۔ مسٹر چیمبرلین نے ایوان کے ممبروں کو (۲۶ جولائی کو بتلایا کہ "برطانوی مفاد اور برطانوی نوآبادیات اور مقبوضات کو بچانے کے لئے حکومت جنگ سے گریز نہ کرے گی اور حکومت چین میں برطانوی مفاد کو کسی قیمت پر بھی قربان کرنے کے لئے طیار نہیں ہو سکتی"

عوام کے سامنے تقریروں میں مسٹر بالڈون (Baldwin) سر جان سائمن (Sir John Simon) اور لارڈ لنڈن ڈری (Lord Londonderry) وغیرہ پرزور انداز میں اس کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ تخفیف اسلحہ کانفرنس کی کامیابی کے لئے دل و جان سے کوشاں ہیں، دوسری طرف نازی جرمنی کو اپنی قوت بڑھانے کا موقعہ دیا جا رہا ہے۔ اطالیہ اور حبشہ کے معاملہ میں شروع سے لیکر اخیر تک حکومت نے میفی رپورٹ (Maffy Report) کے حدود میں معاملہ طے کرنے کی کوشش کی تاکہ اطالیہ جرمنی کے خلاف فرانس و برطانیہ کے ساتھ اتحاد کر لے۔ لیکن دوسری طرف تمام انتخابات میں ناکامی کے ڈر سے وہ یہ راز ظاہر کرنے سے مجبور تھی۔

چیکوسلاواکیا (Czechoslovakia) کے معاملہ میں بھی حکومت کی پالیسی کا محور یہی خیال تھا۔ مسٹر چیمبرلین نے اپنی تقریر (مورخہ ۲۴ مارچ ۳۸ء) میں چیکوسلاواکیا کے متعلق اپنے شکوک کا اظہار کرتے ہوئے سوویٹ روس کی اس پیشکش کا بھی ذکر کیا جس میں اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے اجتماعی اقدام کی دعوت سوویٹ روس نے دی تھی۔ اسوقت سے لیکر چیکوسلاواکیا کے آخری لمحوں تک باوجود اپیلوں اور تجویزوں کے ہماری گورنمنٹ نے اُس کو بچانے کے لئے فرانس اور سوویٹ روس کے ساتھ اشتراک عمل کرنا پسند نہ کیا۔ اس پالیسی کا مقصد کیا تھا؟ اس پر روشنی صرف اس گفتگو سے پڑتی ہے جو مسٹر دلادیر (Daladier) کے سفر لندن میں (۳۸ء کے موسم بہار میں) اُنسے کی گئی تھی یعنی ہٹلر کو وسطی یورپ پر قبضہ بلا کسی جنگ کے کر لینے دیا جائے تاکہ سوویٹ روس کو یورپ کے معاملات میں مداخلت

کا موقعہ نہ ملے۔ اگر سوویٹ روس کی امداد سے ہٹلر کو شکست دی گئی تو نصف یورپ تو ضرور ہی اشتراکی ہوجائے گا اور پھر اس سے دنیا کے دوسرے حصے بھی متاثر ہوں گے جو برطانوی اور فرانسیسی مفاد کے لئے بیحد مضر ہے۔

مسٹر چیمبرلین نے ۸؍اپریل ۱۹۳۸ء کو برمنگھم کے جلسہ میں اس کا صاف اعلان کرنے سے انکار کیا کہ آیا حکومت چکوسلاواکیا کے مسئلہ پر جنگ کرے گی یا نہیں کیونکہ "یہ صرف روپیہ کے ساتھ جوا کھیلنا نہ ہوگا بلکہ ہم کو اپنے بچوں، عورتوں اور مردوں کی جانوں کو بھی داؤں پر لگا دینا پڑے گا جو ہماری ہی نسل کے ہیں اور ہمارے ہی خون و پوست کے بنے ہیں" ۲۴؍مارچ کو مسٹر چیمبرلین نے ایوان میں اس کا اعلان کیا کہ برطانوی نوآبادیات خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں ہوں ان کے بچانے کے لئے حکومت میدان جنگ میں کود پڑے گی۔ فلسطائن، بنگال، عراق اور مصر کے لئے بھی یہی کیا جائے گا۔

ہماری حکومت نے جنگ کی تیاری، تخفیف اسلحہ کانفرنس کے قیام کے ساتھ ہی شروع کی چنانچہ آج اس مد میں اس سے تین گنی زیادہ رقم صرف کی جارہی ہے جو جنگ عظیم کے دوران میں صرف ہوئی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی اقتصادی زندگی کی چول چول ہل رہی ہے اس میں شک نہیں جنگی طیاری نے ملک کی بیکاری کے مسئلہ کو ایک حد تک حل کردیا ہے۔ لیکن اگر کسی اور انداز میں اس کا حل کیا جاتا تو بہتر تھا۔ کیونکہ ان سب کوششوں کے باوجود اسباب زندگی برابر گراں ہو رہے ہیں اور ملک کے میزانیہ کا توازن بگڑ رہا ہے یعنی اسلحہ کی دوڑ سرمایہ داری کی کشتی کو تیزی کے ساتھ گرداب کی طرف لیجا رہی ہے۔

ایڈن اور ہماری حکومت

سابقہ جنگ میں لائڈ جارج کی قومی حکومت نے صدر ولسن کی ذات سے جس طرح فایدہ اُٹھایا تھا اُسی طرح موجودہ قومی حکومت نے ایڈن کی ذات سے فایدہ اُٹھانے کی پوری کوشش کی۔ حکومت کے ارباب حل وعقد اس کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر ایڈن اُن کے ہاتھ لگ گئے تو انتخاب کے موقعہ پر اُن کی پارٹی کو ہر حلقہ سے کم از کم دو ہزار ووٹ تو صرف ایڈن ہی کے نام کی وجہ سے مل جائیں گے۔ حکومت نے ایڈن کی شخصیت کی دلاویزی اور مزدوروں اور متدینین کے طبقوں میں اس کی ہر دلعزیزی سے پورا فایدہ اُٹھایا۔ ایڈن نے صدر ولسن کی طرح تمام جلسوں میں جمہوریت، اور مجلس اقوام کے متعلق اپنے خیالات کو حکومت کے خیالات کا آئینہ سمجھا۔ ایڈن اور ولسن میں ایک فرق تھا اور وہ یہ کہ مستعفی ہونے کی دھمکی تو دونوں نے دی مگر ولسن بعض وجوہ کی بناء پر کبھی مستعفی نہ ہوسکے برخلاف اس کے ایڈن نے استعفےٰ دیدیا۔ مگر ایڈن کے استعفے کے سلسلہ میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں اول تو یہ کہ وزارت سے تو انھوں نے استعفا دیدیا مگر قدامت پسند پارٹی سے وہ علحدہ نہ ہوئے اور وہ یہ کر بھی نہیں سکتے تھے کہ قدامت پسند پارٹی سے علحدہ ہوکر بائیں بازو سے اپنا رشتہ پیدا کریں۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ ایڈن کا استعفا کسی اُصولی اختلاف پر مبنی نہ تھا۔ اس موقعہ پر مجلس اقوام اور چیمبرلین کی پالیسی کے تصادم کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔ بلکہ اس جگہ پر چیمبرلین ہی حق بجانب تھے۔ جس مسئلہ پر انھوں نے استعفا دیا وہ مسئلہ قدامت پسند پارٹی میں خود وجہ اختلاف بنا ہوا تھا۔ یہ مسئلہ اسپین کا تھا۔ ایک طرف مسٹر ایڈن، دفتر خارجہ کی پارٹی پالیٹکس ([illegible])

کی نمایندگی کر رہے تھے اور دوسری طرف مسٹر چیمبرلین کے پیش نظر "طبقہ وار جنگ کی سیاست" (Clan War Politics) تھی۔ سوال صرف یہ تھا کہ برطانوی مفاد کے لئے فسطائی اسپین، کا برطانیہ کے زیر اثر رہنا بہتر ہے یا اٹلی کے زیر اقتدار رہنا۔ آخری لمحوں میں اس کا علم ہوا کہ مسولینی اس کا قایل ہی نہیں کہ معاہدوں کی تعظیم بھی کوئی چیز ہے۔ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوگیا بلکہ لوگوں نے اب یہ بھی محسوس کرنا شروع کیا کہ مسولینی کی نظریں اب سلطنت برطانیہ کی طرف بھی اُٹھ رہی ہیں اور وہ اپنے بڑے ارادوں کی تکمیل میں فتح اسپین کو پہلا قدم سمجھ رہا ہے۔ اس موقعہ پر ایڈن کی حمایت قدامت پسند پارٹی کے بعض ممبروں اور دفتر خارجہ نے کی اور اس کا مطالبہ شروع ہوا کہ اسپین سے غیر ملکی فوجوں کو فوراً منتقل کیا جائے۔

اسپین کے باب میں سیاست خارجہ کی طرف سے تین عذر پیش کئے جاتے ہیں :۔

(۱) سب سے پہلا عذر یہ ہے کہ فرانس کی حکومت نے "عدم مداخلت" کی پالیسی تراشی تھی۔ مانچسٹر گارجین کے نامہ نگار مقیم لندن کا بیان ہے کہ :۔

"پہلی اگست سنہ ۳۶ء کو حکومت برطانیہ نے فرانس کو مطلع کیا کہ اطالیہ اور جرمنی کے مقابلہ میں اسپینی جمہوریت کے لئے فرانس کی حکومت سامان حرب فراہم کر رہی ہے۔ اگر اس کے جواب میں فسطائی طاقتوں نے فرانس پر حملہ کیا تو حکومت برطانیہ اس حملہ کو بے سبب حملہ متصور کرے گی اور اُس حالت میں معاہدۂ لوکارنو (Locarno) کا نفاذ نہ ہوگا"

برطانیہ کی اس پالیسی نے فرانس کی رجعت پسند جماعت کو بیحد تقویت پہونچائی۔ دوسری طرف جرمنی اور اطالیہ نے بھی اس سے فایدہ اُٹھایا

(۲) ہماری حکومت کا دوسرا استدلال یہ ہے کہ "عدم مداخلت" کی پالیسی نے یورپ کے امن کو برقرار رکھا۔ اس استدلال کی بنیاد اس خیال پر قایم ہے کہ اسپین کو فتح کرنے کے لئے اطالیہ اور جرمنی اس درجہ بے قرار تھے کہ اگر برطانیہ و فرانس اسپین کی حکومت کو اُس کے اسلحہ خریدنے کا حق استعمال کرنے دیتے تو فسطائی طاقتیں پورے یورپ میں جنگ کا آغاز کر دیتیں — اول تو یہ خیال ان بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے جس کو تاریخ میں کوئی اہمیت حاصل نہیں اور پھر اس خیال کی تائید کے لئے کوئی ثبوت بھی موجود نہیں ہے۔ برعکس اس کے لوگوں کا خیال ہے کہ اگر برطانیہ و فرانس شروع ہی میں مجلس اقوام کے اُصول اور بین الاقوامی قانون پر مضبوطی سے اڑ جاتے اور باغیوں کو امداد پہونچانے کے بجائے اسپین کی حکومت کو طیارے اور سامان حرب فراہم کرنے دیتے تو ایک، دو ہفتوں میں اس لڑائی کا فیصلہ ہو جاتا

(۳) تیسرا استدلال یہ تھا کہ عدم مداخلت کے معنے یہ ہیں کہ جب کسی ملک میں دو متضاد خیال پائے جائیں تو ان میں سے کسی میں حصہ نہ لیا جائے"۔ یہ جملہ سب سے پہلے ستمبر سنہ ۳۶ء میں اسوقت استعمال کیا گیا جب اسپین نے مجلس اقوام کے سامنے فریاد پیش کی کہ مجلس اقوام کی ایک ممبر ریاست کے خلاف فسطائی طاقتوں نے ظلم کا ایک نیا انداز ایجاد کیا ہے اور یہ مجلس اقوام کی خلاف ورزی ہے۔ برطانیہ نے اس کے جواب میں کہا کہ اسپین میں دو خیالات متصادم ہو رہے ہیں

اور اس موقعہ پر مجلس اقوام مداخلت نہیں کر سکتی۔ اگرچہ مجلس اقوام کے قانون کی دفعہ ۱۰ میں یہ بالکل واضح طور پر موجود تھا کہ اگر مجلس اقوام کے کسی ممبر پر کوئی ظلم کیا جائے تو اُس کی حفاظت مجلس کے ہر ممبر کا فرض ہے اور مجلس کی کونسل کو ایسے موقعہ پر طے کرنا چاہئے کہ اُس ظلم کے خلاف کونسا قدم اُٹھایا جائے۔

اگر ہماری قومی حکومت اسپین کے معاملہ کو مجلس اقوام کی وساطت سے طے ہونے دیتی تو خود اُس کے لئے دو صورتیں ہوتیں۔ ایک تو یہ کہ یا تو وہ فسطائی طاقتوں کی علانیہ ہمنوائی کرتی یا پھر روس و فرانس کے ساتھ مل کر اسپین کو سامان حرب فراہم کرنا پڑتا۔ دسمبر ۳۶ء میں مجلس اقوام نے ایک تجویز پاس کی کہ اسپین کی موجودہ صورت حال مجلس کے قانون کی خلاف ورزی ہے۔ مجبوراً ہماری قومی حکومت کو بھی تسلیم کرنا پڑا۔ ۳۸ء میں پھر ایک تجویز پاس ہوئی جس میں سابقہ تجویز کے اعادہ کے ساتھ ساتھ اس کا بھی اضافہ تھا کہ اسپین میں جو غیر ملکی افواج اسوقت موجود ہیں اُنکو اگر فوراً واپس نہ بلایا گیا تو "عدم مداخلت" کو ختم کر دیا جائے گا۔ جنوری ۳۹ء میں اسپین کے وزیر خارجہ نے مجلس اقوام کی سابقہ تجاویز کو دہراتے ہوئے عملی قدم اُٹھانے کا مطالبہ کیا۔ لارڈ ہیلیفکس (Halifax) نے اس تجویز کی مخالفت میں ووٹ دیا۔ دوسری طرف ہماری قومی حکومت نے فوراً عدم مداخلت کی کمیٹی طلب کی اور مجلس اقوام کو مجبور کیا کہ اس معاملہ کو تمام و کمال اُسی کمیٹی کے حوالہ کر دیا جائے اور اس سلسلہ میں وہ جو مناسب سمجھے کرے۔ لیکن اس کمیٹی میں اسپین کی جمہوریت کی نمایندگی کرنے والا کوئی نہ تھا۔

عدم مداخلت کی حقیقت کا حال اس واقعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جب جنگ کے پہلے ہفتہ میں اسپین کی حکومت نے ایک برطانوی جہاز کو روکا جو باغیوں کے لئے تیل لئے جا رہا تھا، ہماری حکومت نے "بحری اقدام کی دھمکی دی۔ لیکن جب جنرل فرینکو نے برطانوی جہازوں کو ہفتوں روکے رکھا تو اس کے جواب میں صرف مراسلہ روانہ کیا گیا۔

اسپین کے بعد حبشہ کی لڑائی ہوئی اور سقوط حبشہ کے ساتھ بین الاقوامی صورت حال بد سے بدتر ہو گئی چیکوسلاواکیا کے معاملہ نے انگلستان اور فرانس میں جمہوریت کی بنیادیں کمزور کر دیں۔ اب اسپین میں مسولینی کی کامیابی حالات کو خراب تر کر دے گی اور اُس کے بعد آنے والی جنگ کو دنیا کی کوئی طاقت نہ روک سکے گی۔

محمد عتیق صدیقی

(نگار) یہ تھا خلاصہ مسٹر زیلیاکس کے بیان کا جسے محمد عتیق صاحب صدیقی نے پیش کیا ہے۔ اس بیان میں برطانوی سیاست کے صرف اس پہلو سے بحث کی گئی ہے جس ایک مخصوص جماعت (لیبر) کے نقطۂ نظر سے یہ سب کچھ کہنے کا موقعہ ملسکتا ہے، لیکن وہ حکومت برطانیہ ہو یا کوئی اور، ہمیں یا کسی کو یہ کہنے کا حق حاصل نہیں کہ اس کی پالیسی صرف اس لئے غلط ہے کہ وہ ہمارے نقطۂ نظر سے موافق نہیں۔ اس مقالہ کا خلاصہ یہ ہے کہ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد

جو توقعات مزدور طبقہ کو دلائی گئی تھیں وہ بھی پوری نہ کی گئیں اور موجودہ جنگ بھی صرف اس لئے لڑی جارہی ہے کہ امراء و شرفاء کا اقتدار قایم ہو۔ اسی کے ساتھ لکھنے والے نے برطانیہ کی اس پالیسی کو بھی بُرا کہا ہے جو اسنے روس و جرمنی کے مقابلہ میں اختیار کی۔

ایک طرف روس کے انقلاب کا خیر مقدم کرنا، دوسری طرف اس کے دبانے کی مخفی کوششیں کرنا، جاپان کو سائبیریا پر حملہ کرنے کی ترغیب دلانا، اور روس کو دبانے کے لئے جرمنی کی قوت کو بڑھانا، حبشہ اور اسپین میں جمہوریت شکن پالیسی اختیار کرنا، مجلس اقوام کی ساکھ کو تباہ کرنا۔ یہ ہیں وہ الزامات جو برطانیہ پر قایم کئے گئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا یہ تمام اعتراضات کیبر جماعت کے نقطۂ نظر سے ہیں، اور بغیر کسی نقد و تبصرہ کے مان لینے کے قابل نہیں۔

یہ بات ساری دنیا کو معلوم ہے کہ برطانوی حکومت اپنے نظم و نسق کے لحاظ سے دنیا کی ایسی عجیب و غریب حکومت ہے جس کا کوئی نام نہیں رکھا جاسکتا، نہ اسے ہم خالص جمہوری سلطنت کہہ سکتے ہیں، نہ ملوکیت، وہ ملک کے تمام طبقوں کی نمایندہ ہے اور ہر طبقہ کو خوش رکھنا چاہتی ہے۔

اگر انگلستان یا اس کی تمام نوآبادیوں میں سوائے طبقۂ عمال کے کوئی اور طبقہ نہ پایا جاتا، تو اور بات تھی، لیکن جب اس کے مقبوضات میں ایک بڑی جماعت سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی بھی پائی جاتی ہے، تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ انکو بھی وہ طبقۂ عمال کی سطح پر لاکر اپنی پالیسی مقرر کرے۔ اسی لئے برطانوی حکومت روس کی اشتمالیت یا اشتراکیت کو کسی طرح پسند نہیں کرسکتی اور ان تمام امکانات کو سامنے رکھ کر اپنی پالیسی متعین کرتی ہے جو بالشویت کی اشاعت سے متعلق ہیں۔

یہ بالکل درست ہے کہ اس نے یوروپ میں بالشویت کی اشاعت کو روکنے کے لئے جرمنی کو تقویت پہونچائی اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے اسے یہی کرنا چاہئے تھا، لیکن اس پر یہ الزام کبھی قایم نہیں ہوسکتا کہ وہ اب یا کسی وقت نازی یا فسطائی طرز حکومت کی طرفدار تھی یا ہوسکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مجلس اقوام کا اقتدار ختم کردینے کی تمامتر ذمہ داری برطانوی حکومت پر عاید ہوتی ہے، لیکن یہ غلطی اس کی ڈپلومیسی کی تھی۔

گزشتہ جنگ کے بعد اس میں شک نہیں کہ برطانوی کیبنٹ کی سیادت ان لوگوں کو حاصل رہی جو نہ آنے والے طوفان کا صحیح اندازہ کرسکتے تھے اور نہ اس سیلاب سے حکومت کی کشتی کو صحیح و سالم بچا لے جانے کی اہلیت رکھتے تھے، لیکن اس کا الزام بھی سچ پوچھئے تو طبقۂ عمال ہی پر عاید ہوتا ہے، کیونکہ انھیں کے جذبات کی رعایت سے برطانیہ نے ایک عام امن پسند پالیسی قایم کی تھی اور اسی چیز نے آخرکار اس سخت جنگ سے اسے دوچار کردیا۔

اس وقت دُنیا "سرمایہ و عمل" کے درمیان پسی جارہی ہے اور جب تک اس کا فیصلہ نہ ہوجائے امن و سکون

میسر نہیں آسکتا۔ ایک طرف روس کی اشتراکیت ہے جو ساری دُنیا کو مزدور بنا دینا چاہتی ہے، دوسری طرف نازیت و فسطائیت ہے جو شخصی استبداد کے زیر اثر تمام عالم کے روند ڈالنے پر تُلی ہوئی ہے۔ برطانوی حکومت کے لئے بڑی مشکل یہ ہے کہ نہ وہ اپنے یہاں کے طبقۂ عمال کو ناخوش کرنا چاہتی ہے نہ سرمایہ دار جماعتوں کو۔ وہ امن و سکون تو چاہتی ہے لیکن دو متضاد عناصر کو ایک جگہ جمع کرکے اور یہ اتنا دشوار طلب کام ہے کہ اگر برطانیہ اس میں کامیاب ہوگیا تو اس میں شک نہیں، یہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا معجزہ سمجھا جائے گا۔

اشتراکیت آہستہ آہستہ وسط یوروپ میں پھیلتی جارہی ہے کیونکہ وہاں کی سلافی آبادی قدرتاً روس کی طرف مائل ہے لیکن قبل اس کے کہ اس کی گرفت مضبوط ہو اسے مشرق میں جاپان سے اور مغرب میں جرمنی و اٹلی سے نپٹنا ہے۔ انگلستان و امریکہ دونوں اشتراکیت کے مخالف ہیں، لیکن ان کی مخالفت آئینی ہے یعنی اگر آج دونوں جگہ کی اکثر آبادی اس بات کا فیصلہ کرے کہ اشتراکیت ہی اس کے لئے مفید ہے تو پھر مخالفت کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ لیکن بظاہر اس کی کوئی امید نہیں کیونکہ دونوں ملکوں کی آبادی کی نوعیت، روس کی آبادی کی نوعیت سے بالکل مختلف ہے اور ایک ملک کا طرز حکومت اسوقت تک نہیں بدل سکتا جب تک ملک کے حالات اس کے مقتضی نہ ہوں۔

گزشتہ جنگ میں کس ملک سے کیا غلطیاں ہوئیں، اس کے سمجھ لینے میں کوئی حرج نہیں لیکن ان غلطیوں کی تلافی ممکن ہے یا نہیں۔ اس کے سمجھنے کی کوئی صورت نہیں۔ لڑائی ختم ہو تو پتہ چلے کہ گزشتہ غلطیوں کی تلافی ہوئی یا نہیں۔ گو ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی ڈر لگا ہوا ہے کہ مبادا تلافی مافات کے سلسلہ میں پھر کوئی ایسی ہی غلطی ہو جائے جس کے لئے ایک بار اور دُنیا کو اس سے زیادہ سخت جنگ میں مبتلا ہونا پڑے۔

"نگار" کے پُرانے پرچے

"نگار" کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:-

(سنہ ۲۶ء) جنوری ۵؍ ــ (سنہ ۳۰ء) مئی ۴؍ ــ (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴؍ فی پرچہ ــ (سنہ ۳۲ء) جنوری ۱۲؍ فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴؍ فی پرچہ ــ (سنہ ۳۳ء) فروری و جولائی ۴؍ فی پرچہ۔ اکتوبر ۵؍ ــ (سنہ ۳۶ء) جنوری ۱۲؍ ــ فروری تا دسمبر (علاوہ مئی تا اکتوبر) ۵؍ فی پرچہ ــ (سنہ ۳۷ء) جنوری ۱۰؍ ــ مارچ تا اگست ۶؍ فی پرچہ ــ (سنہ ۳۸ء) پورا فائل ۵؍ ــ (سنہ ۳۹ء) جنوری ۱۰؍ ــ فروری تا دسمبر (علاوہ جون و دسمبر) ۶؍ فی پرچہ ــ

منیجر نگار لکھنؤ

ہندوستان

جنّت نشان بھی ہے —— اور جہنّم سامان بھی!

یہ انتقادی مقالہ جناب نوابزادہ راحت سعید خانصاحب کا ہے، جو آنریبل نواب احمد سعید خانصاحب رئیس چھتاری کے صاحبزادے، اور علی گڈھ کے گریجویٹ ہیں۔
آپ اس کی ادبیت کو نہ دیکھئے بلکہ صرف اس بات کو کہ یہ ایک امیرزادے کی تحریر ہے اور وہ بھی دنیا کی نجات اسی میں سمجھتا ہے کہ "سرمایہ داری" کی لعنت کو جلد از جلد دور کر دیا جائے۔ اور وہ بھی وطن کی غلامی پر سر دھنتا ہے۔ یہ ہے ہوا کا رُخ جس کو اب بھی اگر دولتمندوں نے نہ سمجھا تو زمانہ بجبر انھیں سمجھائیگا۔ (اڈیٹر)

جنوری کا مہینہ ہے..... پالے کی شدت نے دریا کے اُس پار آلو کے کھیتوں کو جلا دیا ہے، اتنی سخت سردی کبھی نہ دیکھی نہ سُنی، محسوس ہوتا ہے کہ رگوں میں خون کی گردش رُک جائے گی! ناخن نیلے پڑے جا رہے ہیں، دانت سے دانت بج رہا ہے....

اس سنسان رات میں ایک طرف راجہ کا محل نظر آ رہا ہے —— اس کی تعمیر مزدور کے خون اور کسان کی ہڈیوں سے کی گئی ہے۔ زمانے کے خدا جانے کس قدر گرم و سرد اس نے دیکھے ہیں، تبدیلیاں اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں اور اس لئے خوشی ہو یا غم، گرمی ہو یا جاڑا، اس کا وجود ہر حالت میں یکساں قہقہہ مسرت ہے!
کھڑکیاں اور جھلملیاں بند ہیں، پردے پڑے ہوئے ہیں مگر بجلی کے قمقموں کی روشنی کھڑکیوں میں سے چھن چھن کر باہر آ رہی ہے۔
محل کے اندر ہر کمرہ بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ موٹے موٹے ایرانی قالین بچھے ہوئے ہیں، مصوری کے شاہکار دیواروں پر آویزاں ہیں، دروازوں اور کھڑکیوں پر زربفت و کمخواب کے پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ کمرہ کے گوشوں میں کشمیری میزوں پر اطالوی بُت اور بیش قیمت چینی کا سامان رکھا ہوا ہے —— اور یہ سب سامان کسی یتیم کے گلے پر چھُری

چلا کر یا کسی نوجوان دولہن کا سہاگ لوٹ کر فراہم کیا گیا ہے!

آتشدان سُلگ رہے ہیں۔ بجلی کی انگیٹھیاں کمروں کو گرم رکھنے کے لئے دہک رہی ہیں ——— اور یقیناً ان آتشدانوں میں کسی "عروس یک شبہ" کی تمنائے اولین اور ان برقی انگیٹھیوں میں کسی کی عصمت و عفت مشتعل ہے!۔

اس معصیت کدہ کا گوشہ گوشہ موسیقی کی مقدس و پرکیف صداؤں سے گونج رہا ہے!

کہیں کہیں بخور جلائے جا رہے ہیں اور کسی کسی جگہ عطر سے چلمنوں کو معطر کیا جا رہا ہے، خوش وضع وردیوں میں ملبوس خدام اِدھر سے اُدھر آ جا رہے ہیں خوشامد اور چاپلوسی کا دور دورہ ہے ——— اور زندگی اس بارِ گراں سے اس قدر دبی ہوئی ہے کہ بجائے اُبھرنے کے اس محل کے کونے کونے میں رینگ رہی ہے!

دروازہ پر مسلح پہرا لگا ہوا ہے ——— یہ مہاراج کا ولاس مندر ہے، جہاں اسوقت مہاراج معہ اپنے چند مصاحبین اور عمائد کے بصد شان و شوکت شکن ہیں! دروازہ کچھ کھلا ہے اور کچھ بند جس کے اندر سے رہ رہ کر طلائی گھنگروؤں اور برنجی خلخالوں کی آواز آ رہی ہے ——— "پریا" ——— مہاراج نے ایک داسی کو پکارا!

"داسی حاضر ہے مہاراج" کہتی ہوئی ایک حسین لڑکی مہاراج کے سامنے آئی!

"پریا کچھ سُنا دے .... وہی جو پرسوں سنایا تھا ......"

"جو آگیہ مہاراج!"

داسی کے پاؤں کو حرکت ہوئی ...... مہاراج پر بھی وجد طاری ہو گیا اور شیشہ و مینا پر بھی ......

...... کمرہ نعرہ ہائے تحسین سے گونج اٹھا ——— پاؤں کی حرکت آہستہ آہستہ رقص میں تبدیل ہونا شروع ہوئی اور مہاراج کی حیوانیت اور زیادہ مشتعل ہو گئی۔

"مہارانی تشریف لا رہی ہیں مہاراج" ایک نیم عریاں داسی نے عرض کیا۔

"ایں ——— ابھی ——— کیوں"

جلوت خلوت میں منتقل ہو گئی اور مہارانی دس بارہ داسیوں کی معیت میں تشریف لائیں! ——— مہاراج لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔

"آپ یہاں ناچ رنگ میں کھوئے ہوئے ہیں اور میں وہاں تنہا پریشان ہو رہی تھی!"

"کیا ہوا؟"

"ہماری کی ہیروں والی مالا گم ہو گئی مہاراج ...... وہ سوچ سوچ کر رو رہی ہے مجھ سے تو دیکھا نہ گیا! میں تو یہاں چلی آئی!!"

"اونہہ ——— تو کیا ہوا ...... ہم اُسے کل اور منگا دیں گے۔ صبح ہوتے ہی ...... آؤ تم بھی گانا سنو!"

"آشا کو بخار ہو رہا ہے مہاراج ..... میں اُس کے پاس جاؤں گی"

"وہاں نرس تو ہے نا؟"

"جی مہاراج" ایک داسی نے عرض کیا۔

"اور ڈاکٹر بھی"

"جی مہاراج" ایک اور داسی نے عرض کیا۔

"بس تو پھر تم گانا سنو..... ہاں پریا.......!" (رقص شروع ہو گیا)

جنوری کا مہینہ ہے ۔ پالے کی شدت نے دریا کے اُس پار آلو کے کھیتوں کو جلا دیا ہے، اتنی سخت سردی کبھی دیکھی نہ سُنی..... محسوس ہوتا ہے کہ رگوں میں خون کی گردش رُک جائے گی! ۔ ناخن نیلے پڑے جا رہے ہیں، دانت سے دانت بج رہا ہے ۔ اس سنسان رات میں ایک طرف غریب بیوہ کی کُٹیا ہے! جسے اس عورت کے خاوند نے اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی سے بنایا تھا! ۔ چھپر میں جگہ جگہ سے چھید ہو رہے ہیں کُٹیا کی حالت بیوہ کے دل سے زیادہ تباہ ہے، نیچے پیال بچھی ہوئی ہے ..... جس پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت ایک گدڑی میں لپٹی ہوئی پڑی ہے ۔ یہ عورت سخت بیمار ہے..... اس کا جسم بخار سے پھُنک رہا ہے ..... وہ کراہ رہی ہے ..... رہ رہ کر کھانس رہی ہے... اُس کا سانس اُکھڑا ہوا ہے ..... اُسے نمونیا ہو گیا ہے ۔

اُس کے برابر اُس کی ایک سال کی بچی کچھ ڈھکی کچھ کھُلی ہوئی پڑی ہے، ایک کونے میں ایک ٹوٹی ہوئی ہانڈی، اور دوسرے میں ایک خالی گھڑا رکھا ہوا ہے ۔

بخار کی تیزی میں وہ بڑ بڑا رہی ہے:-

"ارے رام ..... تم چلے گئے اور مجھے یونہی چھوڑ گئے ..... ہے پربھو ...... اری میا... (رونے لگتی ہے) مجھے کسی نے دوا تک نہ دی ..... میں اچھوت ہوں، مجھے کون دوا پلاتا..... (کھانسنے لگتی ہے) ارے رام پانی بھی نہ پلایا..... دُلیا صبح سے بیگار میں گیا ہوا ہے ..... میں نے سپاہی سے کہا تھا (کھانسنے لگتی ہے) اسے چھوڑ جاؤ..... میں اس..... آہ ...... ارے رے اس قابل بھی نہیں کہ اُٹھکر ایک گھونٹ پانی بھی پی سکوں..... گالیاں دینے لگا..... دُلیا کے ایک چانٹا مارا اور لے گیا..... ہائے!

اس کا کیا کروں ..... یہ ننھی سی جان بلک بلک کر مر جائے گی (کھانسنے لگتی ہے) اری میا (رونے لگتی ہے) ابھی ذرا سو گئی ہے ۔ دوپہر سے رو رہی تھی ۔ بھُوکی ہے بدنصیب ..... میرے سینہ کا دودھ بخار سے سوکھ گیا۔ دوپہر کا رندہ آیا تھا، لگان کے تین روپیہ بارہ آنہ مانگتا تھا ۔ میں نے کہا ابھی، ہو گئی منشی جی تو دیدونگی نہیں تو معاف کر دینا

ارے رام میری بچی کا صبر اُس پر ٹوٹے (کھانسنے لگتی ہے) ——— ہتیارے نے سب قُرق کرکے نیلام کر دیا —— چار روپیہ کا پکا.... میں نے کہا منشی جی چوتی مجھے دیدو..... دو آنہ کا دودھ منگا کر تھوڑا اسے پلاؤنگی.... اس کے پیٹ میں دو روز سے ایک بوند پانی بھی نہیں گیا ہے..... کمبخت نے وہ بھی نہ دی ..... بولا میرا حق لاؤ... وہ بھی لے گیا..... اچھا بھیا لے جا تیرا رام بھلا کرے گا..... وہ ہم غریبوں کی بھی سُنے گا...... اُس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں...... لتا بیٹی صبح اسی حالت میں گھاس کھودوں گی، اُس کے پیسوں سے دودھ لاکر تجھے پلاؤنگی (ہاتھ سے بچی کو ٹٹولتی ہے) ارے کوئی پانی (سانس اور زیادہ اُکھڑ جاتا ہے) - پانی .... پا..... پا..... پا..... پانی..... پلا..... و..... و!!! گردن ڈھلک گئی اور موت کے ایک جھٹکے نے غریب دُکھیاری بیوہ کی تکالیف دور کر دیں ——— وہ گرمی اور سردی کے احساسات سے بے خبر ہو کر سو گئی۔

——— ہمیشہ کے لئے ——— ایک دوامی نیند! ——— !؟

بچی کلبلائی اور رونے لگی...... وہ بھوکی تھی..... وہ ماں جو ابھی ابھی بخار اور نمونیا کی حالت میں اپنی بچی کے لئے سب کچھ کرنا چاہتی تھی..... اب اُس کے رونے سے بھی بیدار نہیں ہوتی! کچھ دیر تک تو بچی روتی رہی اور جب اُس نے محسوس کیا کہ ماں جاگتی ہی نہیں تو وہ گھٹنوں کے بل اُس کے سد: پر چڑھ گئی ——— اپنے کانپتے ہوئے ننھے ننھے ہاتھوں سے اُس نے اپنی ماں کے تار تار گریبان کو ادھر اُدھر ہٹا۔ ——— اور اُس کے سرد اور ٹھٹھرے ہوئے سینہ پر منھ رکھکر پڑ گئی ———

——— مگر اے غلام ملک کی غلام بچی! ——— تجھے کیا خبر کہ آج رات کی سخت سردی نے تیری دودھ کی نہروں کو بھی منجمد کر دیا ہے!

راحت سعید

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

نگار سائز کے ۳۴۲ صفحات پر ——— قیمت معہ محصول ۱۲؍ ۱۲؍

مینجر نگار لکھنؤ

اُس لڑائی کے بعد اور اِس لڑائی سے پہلے

جو زمانہ گزرا ہے وہ یورپ کی سیاسی تاریخ کا اتنا دلچسپ اور اس قدر اہم حصہ ہے ہم اس کو سمجھے بغیر موجودہ جنگ کے اسباب اور اس کی حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ موجودہ جنگ کا مستقبل ہمیں معلوم نہیں لیکن اس سے قبل کے اُس زمانہ کا حال ضرور معلوم ہے، جو اس لڑائی کا باعث ہوا، اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس کا مطالعہ ہمیں اس جنگ کے نتیجہ کی طرف بھی رہبری کر سکے۔

ہر چند یہ داستان طویل ہے، لیکن مجھے امید ہے کہ اس کی دلچسپی اس طوالت کو بار خاطر نہ ہونے دیگی، لیکن اگر ہو بھی تو اسے گوارا کرنا چاہئے، کیونکہ اس وقت کا سب سے زیادہ اہم سوال "موجودہ جنگ" ہے اور اس کے اسباب کا علم حاصل کرنا ہر پڑھے لکھے انسان کا فرض ہے۔

یہ بحث تین حصوں میں منقسم ہوگی، پہلے حصہ میں یہ بتایا جائے گا کہ گزشتہ جنگ کے بعد کس کس ملک سے کیا غلطیاں ہوئیں، دوسرے حصہ میں ظاہر کیا جائے گا کہ ہٹلر موجودہ جنگ کے برپا کرنے میں کیوں کامیاب ہوا، اور تیسرے حصہ میں اس بات سے بحث ہوگی کہ لڑائی کے بعد کیا ہوگا اور کیا ہونا چاہئے۔

آج کی صحبت میں اس داستان کا پہلا ٹکڑا سن لیجئے:۔ جس وقت ۳ ستمبر ۳۹ء کو جرمنی کے خلاف برطانیہ نے اعلان جنگ کیا تو بے اختیار لوگوں کے منہ سے نکل گیا کہ "قیامت ہے یہ مصیبت ایک ہی نسل میں دو بار!" یعنی پورے ۲۵ سال بھی ختم نہ ہوئے تھے کہ جرمنی نے پھر دنیا میں لڑائی کی آگ مشتعل کر دی!

لیکن دونوں لڑائیوں کا فرق البتہ نمایاں ہے۔ یعنی پچھلی لڑائی جرمنی نے لڑی تھی اور یہ لڑائی ہٹلر لڑ رہا ہے۔ سنہ ۱۴ء میں ویانا اور برلن کی جرمن آبادی نے اعلان جنگ کیا تھا اور اس مرتبہ صرف ہٹلر اور اس کے چند مشیر اس کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن اس سے جنگ کی ہولناکی کم نہیں ہوتی۔

پچھلی لڑائی میں ایک کرور سپاہی کام آئے، دو کرور زخمی ہوئے، ۹۰ لاکھ بچے یتیم ہوئے اور ۵ لاکھ عورتیں بیوہ ہوئیں۔ یعنی اگر یہ سپاہی زندہ ہو کر چار چار کی قطار میں ہمارے سامنے سے گزریں تو بغیر ایک منٹ کے وقفہ کے پورے ۸۰ دن اور ۸۰ راتیں ان کے گزرنے میں صرف ہو جائیں۔۔۔ کیا امن و سکون کی جستجو کے لئے یہ انسانی قربانیاں کم تھیں؟

لیکن مقصود حاصل نہ ہوا ۔ اب پھر وہی قربانیاں ہم سے طلب کی جارہی ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ اب بھی مدعا ہاتھ آئے گا یا نہیں ؟

جب نومبر ۱۸ء میں فرانس، برطانیہ، اٹلی، امریکہ اور ان کے ساتھیوں کو فتح حاصل ہوئی اور جرمنی معہ اپنے ساتھیوں کے ہار گیا، تو یہ فکر پیدا ہوئی کہ آئندہ کے لئے ایک دوامی صلح کی تدبیر اختیار کی جائے دنیا میں نیا اصولِ حکومت قائم کیا جائے اور اس مقصد کے لئے امریکہ کے صدر (ولسن) اٹلانٹک عبور کرکے پیرس آئے، لیکن نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہ ہوا۔ اس کے متعدد اسباب ہیں۔

بعض نقاد سارا الزام صلح کے معاہدوں پر رکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان معاہدوں کی شرطیں بڑی حد تک تنگ نظری پر مبنی تھیں اور زیادہ تر ان میں جذبۂ انتقام سے کام لیا گیا تھا، تاہم اس میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔

ان عہد ناموں کے ذریعہ سے یہ کوشش کی گئی تھی کہ یوروپ قومیت کے لحاظ سے تقسیم کردیا جائے اور اس طرح پولستانی، زیکی، سلووکی آبادیاں ایک عرصہ تک غلام رہنے کے بعد آزاد ہوگئیں۔ یقیناً یہ تقسیم حق بجانب تھی۔

عہد نامہ ورسائی کی رُو سے "جمعیتِ اقوام" قائم کی گئی، مزدوروں کی بین الاقوامی جمعیت کی بنیاد ڈالی گئی، تخفیف اسلحہ کی تحریک کا آغاز ہوا اور ایک نئی قسم کی حکومت اور پیدا کی گئی جسے "Mandate" کہتے ہیں (یعنی عارضی طور پر کسی ملک کو کسی اور ملک کی سیادت میں دیدینا)

ان عہد ناموں نے تاوان جنگ کے مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ البتہ طے نہیں کیا تھا، بلکہ ایک کمیشن کے سپرد کردیا تھا جس کا نام "کمیشن تاوان جنگ" (Reparation Commission) تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ شرائط عہد نامہ جات بُرے نہ تھے، لیکن ان پر عمل بہت بُری طرح کیا گیا اور اسی طریق کار نے تمام خرابیاں پیدا کیں۔

فاتح ملکوں کی غلطیاں

سب سے پہلی تباہی تو یہ ہوئی کہ پریسیڈنٹ ولسن کو ان کے ساتھیوں نے نکال باہر کیا، یعنی انھوں نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ امریکہ یوروپ کے معاملات سے بالکل علحدہ ہوگیا اور اس نے کہا کہ میں نے جو کچھ قرض دیا ہے وہ تم لوگ واپس کردو اور جو چاہو کرو، مجھے کوئی واسطہ نہیں۔ چونکہ امریکہ ہی جمعیت اقوام کے بنیاد کا باعث ہوا تھا اور وہ اس کا بڑا پرجوش ممبر تھا اس لئے اسکی علحدگی سے اس جمعیت کو کافی نقصان پہونچا اور بجائے اس کے کہ دیانت وامانت سے کام ہوتا، خود غرضی سے کام لیا جانے لگا

تاوان جنگ کی کمیٹی میں بھی امریکہ کے علحدہ ہوجانے سے توازن جاتا رہا اور چونکہ فرانس کو اس کمیٹی کی صدارت حاصل ہوگئی تھی اور بلجیم کا ساتھی تھا، اس لئے برطانوی واطالوی نمایندگی کمزور پڑگئی۔

اس کے بعد چار سال تک برابر کانفرنسیں ہوتی رہیں اور ۲۳ء میں حماقت سے پوائن کارز (Poincare) نے فرانسیسی فوجیں روہر میں داخل کر دیں، لیکن اگلے سال پھر امریکہ نے مداخلت کر کے یہ فیصلہ کیا کہ تاوان جنگ کی قسطیں کر کے جرمنی سے وصول کیا جائے اور چند سال کے بعد یہ قصہ بھی ختم ہوگیا اور تاوانِ جنگ کی ادائی جرمنی نے بند کر دی۔

اس میں شک نہیں کہ اُصولاً تاوانِ جنگ جرمنی کو ادا کرنا چاہئے تھا، لیکن اتحادیئن کے مطالبات اتنے سخت تھے کہ ان پر عمل ناممکن تھا، کیونکہ یہ نہ صرف جرمنی بلکہ برطانیہ کے اقتصادی نظام کے لئے بھی کافی نقصان رساں تھا اور اس طرح متفقہ طور پر سب کو تاوان کا مسئلہ نظر انداز کرنا پڑا۔

جیسا کہ ہم نے ابھی ظاہر کیا، جمعیت اقوام کا اصل بانی امریکہ تھا اور اس لئے اس کے علحدہ ہوجانے کے بعد اور دوسرے ملکوں نے بھی اس سے زیادہ دلچسپی نہیں لی اور معمولی معمولی باتوں پر اس سے علحدگی اختیار کرنی شروع کی۔ اِدھر فرانس نے جرمنی کے خلاف حد بندی کے مسئلہ میں بعض ایسی ضدیں کی کہ برطانیہ ان کو پسند نہ کرتا تھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اختتام جنگ کے بعد فاتح ملکوں میں جو اتحاد پایا جاتا تھا وہ مفقود ہوگیا۔

علاوہ اس کے برطانیہ میں جنگ کے بعد ایک اخلاقی ردِ عمل بھی ہوا اور جنگ کی وجہ سے ملک کو جو نقصان جان و مال کا پہونچا تھا اس نے لوگوں کو لڑائی جھگڑے سے متنفر کر دیا اور عام طور پر لوگوں کو یہ خیال قایم ہوگیا کہ "لڑائی سے فی الحقیقت کوئی بات طے نہیں ہو سکتی کیونکہ جیتنے والے بھی شکست ہی میں رہتے ہیں۔

اس خیال کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب ۱۹۲۰ء میں لوگوں کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں لائڈ جارج اس مرتبہ روس سے نہ بھڑا دیں تو عام اسٹرائک کی لہر ملک بھر میں دوڑ گئی اور جب اس کے دو سال بعد ترکی سے لڑائی کا اندیشہ پیدا ہوا تو لائڈ جارج کی وزارت ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی اور بالڈون ان کی جگہ آ گئے۔ اس آپادھاپی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ لوگ فرانس کے خلاف ہو گئے، کچھ روس کے مخالف بنے رہے اور کچھ جرمنی کے طرفدار ہو گئے اور متحدہ پالیسی غائب ہوگئی۔

فرانس کی حالت البتہ دوسری تھی، کیونکہ جنگ میں اسی کو زیادہ نقصان پہونچا تھا، اسی کا ملک زیادہ تباہ ہوا تھا اور پڑوسی ہونے کی وجہ سے جرمنی کی طرف سے اسے ہمیشہ حملہ کا اندیشہ رہتا ہے اس لئے اس کی پالیسی بدستور مخالفانہ رہی اور وہ بہت سی باتوں میں برطانیہ کا ہمنوا نہ ہو سکا۔

اٹلی چونکہ یہ سمجھتا تھا کہ اسے صلح کانفرنس میں دھوکا دیا گیا ہے اور جرمن نو آبادیوں کی تقسیم میں اسے کوئی حصہ نہیں ملا، اس لئے وہ بھی علحدہ اکڑا ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں جرمنی نو آبادیوں کی تقسیم میں اٹلی کو شامل نہ کرنا بڑی سخت غلطی تھی۔ اگر اسے کچھ حصہ مل جاتا تو آج اس کی پالیسی کچھ اور ہوتی۔

جرمنی

اب جرمنی کو لیجئے - جنگ کے بعد وہاں جمہوریت قائم ہوگئی جس کی بنیاد ویمر (Weimer) میں پڑی تھی - لیکن چونکہ جرمنی کے لئے جمہوریت بالکل نئی چیز تھی اس لئے اس میں خامیاں تھیں، بے اعتباریاں تھیں اور مختلف عناصر کا تصادم بھی، لیکن اس میں شک نہیں کہ اہل جرمنی زندگی میں پہلی مرتبہ آزادی کی لذت سے آشنا ہوئے تھے اور اگر فرانس و برطانیہ ان کے لیڈروں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے اور ان کا وقار اپنے یہاں قائم کردیتے تو جرمنی میں جمہوریت مضبوط ہوجاتی - فرانس و برطانیہ کی یہ بہت بڑی سیاسی غلطی تھی جس کا نتیجہ اب محسوس کیا جارہا ہے -

دوسری غلطی یہ تھی کہ تخفیف اسلحہ کے مسئلہ پر عہد نامۂ ورسائی کے مطابق کبھی عمل نہیں کیا گیا - پریسیڈنٹ ولسن کا مقصود یہ تھا کہ تمام ملکوں کی فوجیں اس حد تک کم کردی جائیں کہ ان کی حیثیت مقامی پولیس کی سی رہ جائے، لیکن تخفیف اسلحہ کی کانفرنسیں طلب کرنے میں اس قدر تساہل سے کام لیا گیا کہ برطانیہ و فرانس تو کیا خود جرمنی بھی اس پر عمل کرنے کے لئے مجبور نہ کیا جاسکا -

اس وقت جرمن جمہوریت کا یہ حال تھا کہ اُس کی مختلف جماعتیں اپنی اپنی جگہ مسلح ہورہی تھیں اور خصوصیت کے ساتھ نازیوں اور اشتراکیت پسندوں کی طیاریاں بہت بڑھی ہوئی تھیں - ان میں باہم دگر قتل و خون ہورہا تھا اور حکومت کی کمزوری کا یہ عالم تھا کہ اس نے سنہ ۲۳ء میں ہٹلر کو غداری و بغاوت کے جرم میں گرفتار کیا بھی تو زیادہ سے زیادہ پانچ سال کی سزا دینے کی ہمت کرسکی اور چھ مہینے کے بعد رہا کردینے پر مجبور ہوگئی -

الغرض، تاوان جنگ کے مسئلہ پر بحث و اختلاف، روہر کی مہم، لوکارنو معاہدہ، جرمنی کا لیگ میں شامل ہونا، تخلیۂ رہائن لینڈ، نازی اقتدار، سنہ ۳۱ء کی عام اقتصادی تباہی، سنہ ۳۲ء میں تخفیف اسلحہ کانفرنس کی ناکامی، اور ہٹلر کا عروج یہ تھیں وہ تمام باتیں جو عہد نامۂ ورسائی کے بعد یوروپ میں ظاہر ہوئیں، جن کا ذمہ دار کسی ایک سلطنت کو قرار نہیں دیا جاسکتا

مجلس اقوام

مجلس اقوام کی بنیاد ڈالنا یقیناً بہت جرأت کا کام تھا، لیکن اس کی ناکامی کا سبب یہ تھا کہ اس کے چلانے والے جری نہ تھے - ہر چند امریکہ کے علحدہ ہوجانے سے اس کی قوت کو کافی صدمہ پہونچا لیکن اگر دوسرے ممالک خود غرضی سے کام نہ لیتے تو اس قدر جلد اس کی موت وقوع میں نہ آتی -

عملی حیثیت سے اس کی سست رفتاری اور بدنیتی کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی ایسے مسئلہ میں ہاتھ ہی نہ ڈالتی جس کے متعلق اسے یہ یقین نہ ہوتا کہ وہ اسے ملتوی کرسکتی ہے -

سنہ ۲۴ء کے اجلاس منعقدۂ جنیوا میں طے کیا گیا کہ اگر دو ملکوں میں کوئی جھگڑا پیدا ہو تو بیچ میں پڑکر اس کا فیصلہ کرادیا جائے اور تمام قانونی نزاعات میں ہیگ (Hague) کی بین الاقوامی عدالت سے چارہ جوئی کیجائے لیکن اگر ملک اس فیصلہ کو تسلیم نہ کرے تو اس کے خلاف دوسرے ممالک موثر طریقہ سے قدم اُٹھائیں -

فرانس کے نمایندہ نے جلسہ میں یہ سوال بھی کیا کہ "موثر طریقہ" سے کیا مراد ہے تو اس پر ہنڈرسن نے میز پر مکا مارتے

ہوئے کہا کہ "اس سے مراد یہ ہے کہ ہم ایسے سرکش ملک کے سر پر کاری ضرب لگائیں گے"۔ فرانسیسی نمایندہ یہ سنکر مطمئن ہوگیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج تک "کاری" کیا ہلکی ضرب بھی کسی سرکش ملک کو نہیں پہونچائی گئی۔ سنہ ۳۱ء میں جاپان نے منچوریا پر حملہ کیا، سنہ ۳۵ء میں اٹلی نے حبشہ پر قبضہ کرلیا، سنہ ۳۸ء میں جرمنی نے زیکو سلیوکیا کو لے لیا اور سنہ ۳۹ء میں پولینڈ پر حملہ کردیا، لیکن ان میں کسی ایک سرکش کے خلاف بھی جمعیت اقوام نے کوئی موثر قدم نہیں اُٹھایا۔

سنہ ۳۱ء اقتصادی حیثیت سے یورپ کا نہایت تباہکن سال تھا، بیکاروں کی تعداد لاکھوں تک پہونچ گئی، حکومت کے بجٹوں میں توازن قایم نہ رہا، کرنسیاں درہم برہم ہوگئیں اور حکومتیں متزلزل نظر آنے لگیں۔ برطانیہ بھی ان حالات سے کافی متاثر تھا، وہاں بھی لیبر وزارت کی جگہ نیشنل وزارت قایم ہوئی اور محکمۂ خارجہ کی باگ بجائے ہنڈرسن کے پہلے لارڈ ریڈنگ اور پھر سر جان سائمن کے ہاتھ میں دی گئی، لیکن باوجود ان تمام باتوں کے کسی شخص کو یقین نہ تھا کہ یوروپ میں جلد کوئی دوسری جنگ شروع ہوسکتی ہے ـــــ البتہ جاپان نے جو یوروپ کے اس اقتصادی عدم توازن کو نہایت غور سے دیکھ رہا تھا محسوس کیا کہ یہی وقت کام نکالنے کا ہے، چنانچہ اس نے ایک نہایت ہی معمولی بہانہ ڈھونڈھ کر کہ ایک جاپانی سپاہی کو چینیوں نے مار ڈالا ہے، منچوریا پر حملہ کردیا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اسوقت یوروپ خود اپنی مصیبت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس کی راہ میں مزاحم نہ ہوگا اور یہی ہوا۔

اگر برطانیہ اس وقت ذرا جرأت سے کام لیتا اور امریکہ و روس کے تعاون سے وہ جاپان کے اس حملہ کو ناجائز قرار دیکر اقتصادی و مالی دباؤ ڈالتا تو یقیناً کامیابی ہوتی اور مجلس اقوام کا بھرم قایم ہوجاتا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس اقوام کی اہمیت ختم ہوگئی۔

جب سنہ ۳۲ء میں تخفیف اسلحہ کانفرنس ہوئی تو امریکہ اور روس کے نمایندے بھی اس کو کامیاب بنانے کے لئے شریک ہوئے تھے، لیکن اس کانفرنس کی ناکامی کا سبب بھی برطانیہ کی ڈھیل تھی۔

اٹلی کی طرف سے گرانڈی (Grandi) نے یہ تجویز پیش کی کہ نامناسب ذرایع حرب (مثلاً بڑے جنگی جہاز، آبدوز کشتیاں، بم برسانے والے طیارے، ٹینک اور زہریلی گیس وغیرہ) جو جرمنی کے لئے ممنوع قرار دئے گئے ہیں، وہ دوسرے ملکوں کے لئے بھی ہونا چاہئے۔ اس تجویز کا سب نے خیر مقدم کیا لیکن فرانس نے ایک شرط اور عاید کی وہ یہ کہ اسی کے ساتھ ایک بین الاقوامی فوج بھی قایم کرنا چاہئے جو ان تمام شرائط کی پابندی تمام ملکوں سے کراسکے۔

اگر برطانیہ نے گرانڈی کی تجویز کی حمایت کی ہوتی تو فرانسیسیوں کو کچھ مراعات دینے کے بعد بعض معمولی ترمیمات کے ساتھ یہ تجویز منظور ہوجاتی، لیکن سر جان سائمن نے یہ تحریک کی کہ پہلے ایک کمیشن کے ذریعہ سے یہ بات طے ہوجانا چاہئے کہ کونسے ذرایع حرب "نامناسب" کہے جاسکتے ہیں۔ اس سے مقصود ان کا صرف بات کو ٹالنا تھا اور کچھ نہیں۔

اس کے بعد فرانس و امریکہ نے کچھ تعمیری تجویزیں پیش کیں۔ امریکہ نے یہ تجویز پیش کی کہ تمام جنگی جہازوں کی تعداد ایک تہائی اور دوسرے قسم کے جہازوں کی تعداد ایک چوتھائی کم کردیجائے، اسی کے ساتھ آبدوز کشتیوں کا وزن بھی گھٹا دیا جائے اور بم برسانے والے طیارے اور ٹینک بالکل منسوخ کردئے جائیں۔ فرانس نے ایک تفصیلی اسکیم پیش کی کہ تمام فوجی ہوائی قوت کو ختم کردیا جائے اور تمام پرائیویٹ کارخانہ جات اسلحہ سازی کو توڑ دیا جائے، لیکن برطانیہ نے نہ امریکہ کی تجویز کی حمایت کی نہ فرانس کی اسکیم کی اور تیرہ مہینے کے بعد اس کی موافقت کی بھی تو اس انداز سے کہ خود اپنے آپ کو ان تمام پابندیوں سے مستثنٰے قرار دیا، آخر کار اکتوبر ۳۳ء میں جرمنی کانفرنس سے علٰحدہ ہوگیا اور اس نے نہایت زور شور سے اپنے آپ کو مسلح کرنا شروع کردیا۔

اس کے بعد دوسرا واقعہ جس نے مجلس اقوام اور برطانیہ دونوں کے اقتدار کو سخت صدمہ پہونچایا وہ اٹلی و حبشہ کی جنگ کا تھا۔ اگر اسوقت فرانس و برطانیہ دونوں ملکر حبشہ میں اطالوی سیادت کی تجویز پیش کردیتے تو شاید اٹلی و حبشہ دونوں منظور کرلیتے، لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ کیوں؟ اس کی وجہ بھی سُن لیجئے:

جب اپریل ۳۵ء میں ہٹلر نے آسٹریلیا کے خلاف فوجکشی کا ارادہ کیا تو اسٹریسا (Stresa) میں فرانس، برطانیہ اور اٹلی کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں ان تینوں نے یوروپ میں امن قایم رکھنے کی ذمہ داری لی اور مسولینی نے اپنی فوجیں آسٹریا کی سرحد پر بھیجکر ہٹلر کے اس اقدام کو بروقت روک دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کانفرنس میں اٹلی کو یہ سمجھنے کا موقعہ دیا گیا تھا کہ اگر اس نے یوروپ کے معاملات میں فرانس و برطانیہ کا ساتھ دیا تو حبشہ میں وہ جو چاہے کرے۔

ہر چند سر سموئیل ہور نے اس سے انکار کیا، لیکن مسولینی نے ضرور یہی سمجھا تھا اور جس کی تصدیق فرانس و برطانیہ کے اس طرز عمل سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے جنگ حبشہ میں اختیار کیا۔ اگر صرف پٹرول ہی کی ناکہ بندی کردیجاتی تو شاید اٹلی کامیاب نہ ہوتا، لیکن برطانیہ اور برطانیہ سے زیادہ فرانس نے اس کو ٹالنے کی کوشش کی۔ برطانیہ نے بعض تجویزیں پیش بھی کیں لیکن فرانس کے بعض ناعاقبت اندیش لوگوں نے جواب دیا کہ حبشہ کا معاملہ فی الحقیقت برطانیہ اور اٹلی کی آویزش کا ہے، فرانس سے اُسے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کا انتقام برطانیہ کے ناعاقبت اندیش لوگوں نے یوں لیا کہ جب جرمن افواج رہائن لینڈ میں داخل ہوئیں اور فرانس نے اس سے مدد چاہی تو انھوں نے بھی کہدیا کہ یہ جھگڑا فرانس و جرمنی کا ہے، ہم سے کوئی تعلق نہیں۔

بہرحال حبشہ و اٹلی کی جنگ نے یہ بات ساری دنیا پر واضح کردی کہ ایک کمزور ملک مجلس اقوام میں شریک ہوکر قوی دشمن کی زد سے نہیں بچ سکتا۔ نہ حبشہ کی فریاد سنی گئی، نہ اسپین کی، نہ چین محفوظ رہسکا نہ زیکوسلوویکیا، یہانتک کہ جرمنی، روس، جاپان، اٹلی سب مجلس اقوام سے علٰحدہ ہوگئے اور وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔

اقتصادی اسباب اگر ۱۹۱۸ء کے بعد یوروپ کی آبادی اپنے معیار زندگی میں کوئی اچھی تبدیلی محسوس

کرتی، اور بے روزگاری پیدا نہ ہوتی تو کم از کم موجودہ نسل اس جنگ کو نہ دیکھتی، لیکن سیاسی غلطیوں کے ساتھ اقتصادی غلطیاں بھی ایسی ہوئیں کہ سارا یوروپ ان سے تنگ آگیا۔ کرنسی میں نوٹوں کی تعداد محفوظ سونے سے کہیں زیادہ ہوگئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں کے پاس روپیہ تھا انھوں نے بیرونی مبادلہ کے گھٹ بڑھ سے بہت دولت جمع کر لی اور متوسط الحال لوگ تباہ ہوگئے۔

اس کے بعد برطانیہ اور جرمنی میں کساد بازاری کا دور آیا کارخانے ٹوٹے، سرمایہ دار تباہ ہوئے اور بے روزگاری پھیلنے لگی یہانتک کہ لاکھوں انسان فاقہ کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں انقلاب کے جذبات پیدا ہونے لگے اور ایک طرف اشتراکیت دوسری طرف نازیت نے جنم لیا۔

سنہ ۲۵ء میں پھر حالت بدلی اور صنعت و تجارت چمک اٹھی۔ یہاں تک کہ صنعتی پیداوار بہ نسبت پہلے کے ۸ فیصدی بڑھ گئی، بے روزگاری بھی جاتی رہی، معیار زندگی بھی بدلا، لوگوں کے چہروں پر رونق بھی آگئی، لیکن یہ سب عارضی باتیں تھیں۔ سنہ ۲۹ء میں دوبارہ ردِ عمل ہوا، صنعتی پیداوار گھٹنے لگی، اور پھر سارا اقتصادی توازن درہم برہم ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مصیبت اقتصادی نہ تھی بلکہ "مالیاتی" تھی۔ بہر حال جو کچھ سبب رہا ہو، حالات بہت خراب ہوگئے، یہانتک کہ برطانیہ کو بھی اپنا معیار بجائے سونے کے چاندی کا کر دینا پڑا۔

اس اقتصادی تباہی اور لوگوں کی بیروزگاری و پریشانی کا اثر ملکوں کے سیاسیات پر بھی پڑا اور ہٹلر کے عروج میں بھی بڑی حد تک اس نے مدد کی۔

(باقی)

طلسم عمل

اردو زبان میں پہلی کتاب جسمیں "نفسیات" کے اس راز کو کھول کر بیان کیا گیا ہے کہ ایک انسان کیونکر کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے۔

یہ ترجمہ ہے مسٹر ڈیل کارنیگی کی اس مشہور کتاب کا جو شایع ہوتے ہی لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوگئی۔

ترجمہ اس قدر سلیس و سادہ ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ مصنف نے اپنے تجربات و مشاہدات کے ذریعہ سے نفسیاتی حقایق کو اس طرح پیش کی ہے، کہ ایک افسانہ کی دلچسپی اس میں پیدا ہوگئی ہے۔ کتاب کو ایکبار شروع کرنا اسے ختم کر دینا ہے

قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ

منیجر نگار لکھنؤ

کرن اور کنتی

شادی سے قبل رانی کنتی کے کرن نامی ایک لڑکا پیدا ہوا جو جوانی میں کوروؤں کی فوج کا سپہ سالار ہوگیا۔ رسوائی سے بچنے کے لئے اس نے اسے پیدا ہوتے ہی پھینک دیا اور ادھیرتھ نامی ایک رتھبان نے اسے اپنے بیٹے کی طرح پالا۔

کرن:- میں ادھیرتھ رتھبان کا بیٹا کرن ہوں اور یہاں متبرک گنگا کے کنارے ڈوبتے ہوئے سورج کی پوجا کے لئے بیٹھا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو؟

کنتی:- میں وہ عورت ہوں جس نے تمھیں سب سے پہلے اُس روشنی سے روشناس کیا جس کی تم پوجا کر رہے ہو۔

کرن:- میں نہیں سمجھا، لیکن تمھاری آنکھیں میرے دل کو اسی طرح پگھلا رہی ہیں جس طرح صبح کا سورج پہاڑ کی چوٹی پر برف کو پگھلاتا ہے۔ اور تمھاری آواز میرے دل میں غیر معلوم افسردگی پیدا کر رہی ہے جس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی اے اجنبی عورت۔ مجھے بتا وہ کیا راز ہے جو میری پیدائش کو تجھ سے وابستہ کرتا ہے؟

کنتی:- میرے بچے۔ صبر کر۔ میں اسوقت جواب دوں گی جب تاریکی کے پپوٹے دن کی راز جو آنکھوں پر ڈھک جائیں گے اس اثنا میں تم یہ جان لو کہ میں کنتی ہوں۔

کرن:- کنتی! ارجن کی ماں؟

کنتی:- ہاں، حقیقتاً تمھارے حریف ارجن کی ماں، لیکن تم مجھ سے نفرت نہ کرو۔ مجھے ہستناپور میں سپہ گری کی آزمائش کا وہ دن اب تک یاد ہے جب تم نے ایک غیر معروف لڑکے کی حیثیت سے رات کے تاروں کے درمیان صبح کی پہلی کرن کی طرح بے باکانہ میدان میں قدم رکھا۔ اور ایک عورت کی آنکھوں نے تمھارے چھریرے جسم کو بوسہ دیا جبکہ وہ شاہی خاندان کی عورتوں میں پھول دار پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی، تم جانتے ہو یہ عورت کون تھی؟ ارجن کی ماں!

اتنے میں ایک برہمن آگے آیا اور بولا "قوت کی آزمائش میں کوئی ادنیٰ طبقہ کا نوجوان، ارجن کو دعوت مقابلہ نہیں دے سکتا" تم شام کے گرجنے والے بادل کی طرح ساکت کھڑے رہے اور ایک عورت کا دل غصہ سے جل گیا۔ تم کو معلوم ہے یہ عورت کون تھی؟ ارجن کی ماں!

تحسین ہو دریودھن پر جس نے تمھاری قدر جانی اور اسی وقت اسی جگہ تمھیں انگا کے بادشاہ کا تاج پہنا کر

کوروؤں کے لئے ایک مردِ میدان پالیا۔ اس خوش قسمتی پر خوشی سے بے قابو ہو کر ادھیر تھ رتھ بان مجمع کو چیرتا ہوا آیا اور تم پانڈوؤں اور ان کے دوستوں کے طنز آمیز قہقہوں کے درمیان فوراً اس کی طرف لپکے اور اپنا تاج اس کے قدموں میں ڈال دیا۔ لیکن پانڈوؤں کے گھرانے کی ایک عورت تھی جس کا دل بہادرانہ افتخار پر خوشی سے دھک دھک کرنے لگا۔ تم جانتے ہو یہ عورت کون تھی؟ ارجن کی ماں!

کرن :- لیکن اے راجاؤں کی ماں، یہاں تم تنہا کیسے آئیں۔

کنتی :- میری ایک استدعا ہے۔

کرن :- مجھے حکم دیجئے تاکہ جو کچھ میری مردانگی اور میری عزت اجازت دیتی ہے اسے آپ کے قدموں پر نثار کر دیا جائے۔

کنتی :- میں تمہیں لینے کے لئے آئی ہوں۔

کرن :- کہاں؟

کنتی :- اپنی چھاتی سے لگانے کے لئے جس میں تمہاری محبت کی لگن ہے۔ میرے بچے۔

کرن :- اے پانچ بہادر راجاؤں کی خوش قسمت ماں۔ مجھ ادنیٰ طبقہ کے معمولی سردار کے لئے تمہارے پاس جگہ کہاں؟

کنتی :- تمہارا حصہ میرے اور بیٹوں سے کہیں زیادہ ہے۔

کرن :- مگر مجھے اس کے حاصل کرنے کا کیا حق ہے؟

کنتی :- تمہاری ماں کی محبت کا حق۔ تمہارا اپنا ایشور کا دیا ہوا حق۔

کرن :- شام کی تاریکی زمین پر پھیل رہی ہے پانی پر خاموشی طاری ہے اور تمہاری آواز مجھے بچپن کی اُس ابتدائی دُنیا میں واپس لئے جاتی ہے جو احساس کی مدھم روشنی میں گم ہو گئی ہو۔ خیر۔ خواہ یہ خواب ہو یا فراموش شدہ حقیقت۔ تم میرے قریب آؤ اور میری پیشانی پر اپنا سیدھا ہاتھ رکھو۔ سنا ہے کہ میری ماں نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ اکثر رات کو وہ مجھے خواب میں نظر آتی ہے لیکن جب میں کہتا ہوں "اپنا نقاب اُٹھاؤ اور مجھے اپنا چہرہ دکھاؤ!" تو وہ غائب ہو جاتی ہے۔ کیا وہی خواب آج شام کو حالتِ بیداری میں دیکھ رہا ہوں؟ دیکھو دریا کے اس پار تمہارے بیٹوں کے خیمے ہیں، اور اس طرف کوروؤں۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کل کے ہنگامۂ جنگ سے قبل اس میدان کے بھیانک سکوت میں میرے حریف (ارجن) کی ماں کی آواز کیوں مجھے بھولی ہوئی ماں کا پیغام سناتی ہے؟ اور اس کی زبان سے میرا نام ادا ہونے میں اس قدر موسیقیت کیوں پیدا ہوتی ہے کہ میرا دل اس کے اور اس کے بھائیوں کے لئے نکلا پڑتا ہے؟

کنتی :- میرے بچے - دیر نہ کرو اور میرے ساتھ آ!

کرن :- ہاں میں آؤں گا۔ میری روح تمہاری ہر آواز پر لبیک کہتی ہے اور میرے لئے فتح و شہرت اسی طرح بے اصل ہو گئی جیسا صبح کے سکوت میں رات کا پریشان خواب - یہ بتاؤ کہ تم مجھے کہاں لے جانا چاہتی ہو؟

کنتی :۔ دریا کے اس پار جہاں ریت کے اس پار چراغ جل رہے ہیں۔

کرن :۔ کیا وہاں مجھے میری گمشدہ ماں ہمیشہ کے لئے مل جائے گی؟

کنتی :۔ ہاں، مل جائے گی۔

کرن :۔ تو پھر تم نے مجھے کیوں نکال دیا تھا ــــ میرے اور ارجن کے درمیان قرابت کے قدرتی تعلق کو حقارت کی مہیب کشش سے بدل کر ایک اتھاہ غار کیوں پیدا کر دیا گیا؟ تم خاموش کھڑی ہو۔ تمہاری غیرت سے میرے اعضاء میں زبردست تاریکی سرایت کر رہی ہے اور ان میں غیر معمولی کپکپی پیدا ہو رہی ہے۔ میرے سوال کو بے جواب ہی چھوڑ دو! مجھے مت سمجھاؤ کہ وہ کیا چیز تھی جس نے تمہیں اپنے بیٹے سے اس کی ماں کی محبت چھین لینے پر آمادہ کیا! مجھے صرف اتنا بتا دو کہ آج تم مجھے کیوں اس بہشت کے کھنڈروں میں واپس لیجانے کے لئے آئی ہو جسے تم نے خود اپنے ہاتھوں سے تباہ کیا تھا؟

کنتی :۔ تمہارے طعنوں سے زیادہ شدید لعنت مجھ پر مسلط ہے۔ حالانکہ میں پانچ بیٹے رکھتی ہوں لیکن میرا دل پہلوٹی کے بچے کے لئے اس طرح بجھ گیا ہے جیسے اُسے زندگی کی تمام مسرتوں سے محروم کر دیا گیا ہو۔ مجھے وہ منحوس دن یاد ہے جب میں نے تمہیں دھوکا دیا، لیکن آج وہی تمہاری بے وفا ماں درخواست کرتی ہے کہ تم اپنی معافی سے اسکے گناہوں کو ختم کر دو۔

کرن :۔ ماتا۔ میرے آنسو قبول کرو۔

کنتی :۔ میں اس امید سے نہیں آئی ہوں کہ تمہیں پھر اپنی آغوش میں لوں بلکہ اس خیال سے آئی ہوں کہ تمہیں تمہارے حقوق دلوا دوں۔ آؤ اور راجہ کے بیٹے کی طرح اپنے بھائیوں سے اپنا جائز حق حاصل کرو۔

کرن :۔ میں ایک رتھ بان کا بیٹا ہوں اور عالی نسب ہونے کی بزرگی کی خواہش نہیں کرتا۔

کنتی :۔ نہیں، آؤ، اور اس سلطنت پر قبضہ کرو جو تمہارا حق ہے۔

کرن :۔ کیا تم جس نے مجھے ماں کی محبت سے محروم کر دیا تھا اب سلطنت کا لالچ دلاتی ہو؟ میرے لئے شرم کی بات ہوگی اگر میں راجاؤں کی ماں کو ماں بنالوں اور رتھ بان کے گھر میں اپنی ماں کو چھوڑ دوں!

کنتی :۔ میرے بیٹے سچ ہے! ایشور کا عدالت پوشیدہ طریقہ پر ایک چھوٹے بیج سے ایک تناور درخت ہو جاتا ہے۔ اُدہی مجبور و لاچار بچہ جس سے اس کی ماں بچھڑ گئی تھی، آج اپنے بھائیوں کو شکست دینے کے لئے پورا آدمی ہو کر واپس آتا ہے!

کرن :۔ ماتا۔ ڈرو مت! مجھے یقین ہے کہ کامیابی پانڈوؤں کو ہوگی۔ لیکن مجھے ان کا ساتھ چھوڑنے کو مت کہو جنکی قسمت میں ہارنا لکھا ہے۔ پانڈوؤں کو تخت جیتنے دو کیونکہ انہیں جیتنا چاہئے۔ میں بدنصیب کوروؤں کے ساتھ ہوں۔ میری پیدائش کے وقت تم نے مجھے بے نام چھوڑ دیا تھا اس لئے آج بھی شکست و موت کا انتظار کرنے کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دو۔

(ٹیگور)

سید اصغر علی

ہندستانی اور اُردو دونوں ایک ہیں

(اُردو کانفرنس منعقدۂ بریلی میں پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کا خطبۂ صدارت)

خواتین و حضرات!

ایک بات میں نہایت ادب سے عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ابتدا تو میں خواتین و حضرات دونوں سے کرتا ہوں لیکن آگے چل کر اگر صرف "حضرات" میری زبان سے نکلے تو خواتین بُرا نہ مانیں اور حضرات خوش نہ ہوں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا کہتے وقت حضرات تو زیادہ سے زیادہ میری آنکھوں کے سامنے ہوں گے، خواتین یقیناً دل میں ہوں گی!

حضرات! معاف کیجئے میں نے تو بڑی کوشش کی کہ مجھ سے آپ کا سابقہ نہ پڑے اس لئے کہ غائبانہ تعارف میں فریقین بالعموم فایدہ میں رہتے ہیں۔ سامنا اور سابقہ ہونے پر بہت کم ایسا ہوا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے بارے میں اچھی رائے قایم کرتے ہوں۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ مجھے اپنے آپ پر بھروسہ نہیں یا آپ کے بارے میں مجھے خلاف توقع کوئی رائے قایم کرنی پڑی۔ بات یہ ہے کہ اُردو ہندی کی بحث چھڑ جاتی ہے تو لوگ یہ سمجھ کر کہ "جو گنہ کیجئے ثواب ہے آج" ایسی ایسی باتیں کر گزرتے ہیں جن سے لڑائی کے زمانہ اور آموں کی فصل میں دور ہی رہنا بہتر ہے۔

حضرات آپ کو نہیں معلوم کہ مجھ کو آپ پر اور آپ کو مجھ پر مسلط کرنے میں کن کن بزرگوں نے کیا کیا حصہ لیا ہے۔ میں صدارت کرنے پر آمادہ نہ ہوا تو مقالہ پڑھنے پر مجبور کیا جانے لگا۔ مقالہ سے معذوری ظاہر کی تو دونوں کی فرمائش کی گئی۔ میں نے یہ عذر پیش کیا کہ میں اتنا بڑا آدمی ہونا پسند نہیں کرتا کہ خطبۂ صدارت دینے پر اُتر آؤں اور نہ اتنی قابلیت یا ہمت کہ مقالہ تیار کرسکوں۔ بہرحال آپ کے سامنے جو کچھ پیش کیا جائے گا اُس سے آپ خود بخود اندازہ لگالیں گے کہ جو شخص خطبۂ صدارت اور مقالہ دونوں سے بچنا چاہے اس کا انجام کیا ہونا چاہئے یا پھر اچھا خاصا معقول آدمی صدارت کی کرسی پر بیٹھ کر علیہ اور خیالات دونوں اعتبار سے کتنا مضحکہ انگیز یا قابل رحم بنجاتا ہے! بایںہمہ آپ نے جس لطف و مرحمت سے میری توقیر بڑھائی ہے اُس کا میں دل سے احسانمند ہوں۔

حضرات! میرے دیار اور میرے بچپن میں ایک بڑھیا رہتی تھی۔ اس کا پیشہ تو محلّہ والوں کے ہاں پانی بھرنا تھا

لیکن مشغلہ یہ تھا کہ جس چیز کے کھانے کا اس کا دل چاہتا تھا اسے خرید کر یا پکا کر اسی چیز کے سرپرست پیر کا مجھ سے فاتحہ دلواتی تھی اور تھوڑا سا تبرک مجھے حوالہ کر کے بقیہ سارے کا سارا خود کھالیتی تھی۔ بڑھیا کی اس کمزوری سے سارا محلہ واقف تھا اور میری کمزوری سے صرف بڑھیا۔

مجھے اس وقت کیا معلوم تھا کہ فاتحہ خوانی کی رسم اتنی عام ہو جائے گی اور میں خاص طور پر پکڑا جاؤں گا۔

اب میں دیکھتا ہوں کہ یہی بات نہایت وسیع اور منظم پیمانہ پر ہماری پبلک زندگی میں سرایت کر چکی ہے۔ جب کسی شخص یا جماعت کا دل چاہا اُس نے اپنی پسند کے مطابق ایک محفل فاتحہ خوانی قایم کر دی۔ کسی فاتحہ خواں کو بلالیا، کھایا پیا شور مچایا یا کھلایا پلایا رخصت کر دیا۔ رزولیوشنوں کا تبرک زیادہ تر تو دفتر ہی میں رکھ لیا گیا یا ایک آدھ کہیں شایع کرا دیا۔ ما بخیر شما بسلامت!

مجھے یقین نہیں ہے کہ آج کی محفل میں بھی یہی ہونے والا ہے لیکن ایسا ہوا تو مجھے تعجب نہ ہوگا۔ نہ ہوا تو سب کچھ ہو گیا!

حضرات، اب مجھے اجازت دیجئے کہ میں بعض ایسے مفروضات کا کچھ تذکرہ کر دوں جن کو ذہن میں رکھ کر میں آپ سے مخاطب ہونا چاہتا ہوں۔

(۱) اول تو یہ کہ میں سمجھتا ہوں کہ آج کی محفل پڑھے لکھوں کی محفل ہے یا کم سے کم ایسے لوگوں کی جو لکھنا پڑھنا بُرا نہیں سمجھتے اور نہ پڑھے لکھے لوگوں کو رسوا کرنا اچھا سمجھتے ہیں اس لئے مجھے توقع ہے کہ دوران تقریر یا مباحثہ میں آپ خواہ مخواہ نہ بگڑیں گے نہ شور مچائیں گے اس کے لئے بھی مواقع ملیں گے اور ملتے رہتے ہیں گو اس کے لئے ضروری ہے کہ کم سے کم مجھے آپ پہلے سے اطلاع دیدیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ جب آپ نے مجھے بلایا ہے تو آپ اپنی ذمہ داری بھی محسوس کرتے ہوں گے یعنی جو کچھ میں اپنے نقطۂ نظر سے مناسب اور ضروری سمجھوں گا، کہوں گا۔ اس کا خیال نہ کروں گا کہ آپ کو وہ پسند ہے یا نہیں۔ یا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں یا نہیں۔

(۳) تیسرے یہ کہ میں اُس درسگاہ کا ساختہ پرداختہ ہوں جو فرقہ پرستی کی لعنت سے ہمیشہ پاک رہا۔ جہاں ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ، پارسی معقول نامعقول چھوٹے بڑے، امیر غریب سب ساتھ رہتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کھانے پینے، ہنسنے بولنے اور مرنے جینے میں کبھی کسی کے ذہن میں نہیں آتا کہ کون کیا ہے اور کیا نہیں۔ میں اس محفل میں بھی اُسی عزم و اعتماد کے ساتھ حاضر ہوا ہوں جس عزم و اعتماد سے علی گڈھ میں رہتا سہتا اور فخر کرتا ہوں اس لئے میں وہی کہوں گا جو میرے دل کی بات ہوگی اور جس کو میں بہتر سمجھتا ہوں، نہ وہ جو کسی اور کے دل کی بات ہو یا جس کو کوئی اور بہتر سمجھتا ہو۔

(۴) چوتھے یہ کہ بیشتر یہ نوجوانوں کا مجمع ہے جو سب کچھ ہوتے ہیں مایوس الحال اور تنگ نظر نہیں ہوتے غلطی جلد کرتے ہیں لیکن اس سے کہیں جلد غلطی معاف کر دیتے ہیں۔

(۵) پانچویں اور آخری بات یہ ہے کہ میں اپنے لئے مسلمان ہونا سب سے بڑی فخر کی بات سمجھتا ہوں لیکن اُردو کی حمایت مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس بنا پر کہ ہندوستان کی سب سے زیادہ مقبول اور ترقی پذیر زبان ہے اور ہمارے آپ کے بزرگوں کی بڑی مبارک نشانی اور محترم میراث ہے۔ جس کو بچانا، قایم رکھنا اور ترقی دینا ہر محب وطن کا فرض ہے۔ پھر اس بات کو بھی یاد رکھئے کہ مسلمانوں کا ایک شیوہ یہ بھی ہے کہ وہ حق کی حمایت حمایتیوں کے بھروسہ پر نہیں بلکہ صرف حق کے لئے کرتے اور کر سکتے ہیں لیکن انھیں کامل یقین ہے اور وہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں کہ اُردو کی حمایت میں آج بھی اُن کے ساتھ بڑے بڑے غیر مسلم اہل قلم اور محب وطن ہیں اور یہ وطن دوستوں کی بڑی ہمت افزائی کا موجب ہو۔

اُردو کی تاریخ ہندو مسلمان کے اچھے تعلقات کی تاریخ ہو

صاحبو، اُردو ہندی ہندستانی ایک ہی زبان کے مختلف نام ہوں یا نہ ہوں اس بدنصیب ملک کے خوش نصیب لیڈروں کے لڑنے جھگڑنے کے مختلف بہانے ضرور ہیں۔ اب ہماری حالت یہ ہے کہ اُردو ہندی کا نام آتے ہی فوراً کان کھڑے کر لیتے ہیں اور ایک دوسرے کو شبہ اور عداوت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ گویا یہ دو نام ایسے ہیں جن کے لیتے ہی ہندو مسلمانوں میں جو باتیں نہایت خراب و خطرناک ہیں وہ سب ہمارے سامنے آجاتی ہیں اور ہمارے لئے اس کے سوا چارہ کار نہیں رہتا کہ ہم ایک دوسرے کی جان کے پیچھے پڑ جائیں۔ ہندی سے بدکنے والا میرے نزدیک مضحکہ انگیز نہیں تو قابل رحم ضرور ہے اور اُردو سے بھڑکنے والا بے خبر اور بے بصر۔

صاحبو، اُردو کی تاریخ اس ملک کی دو بڑی قوموں، ہندو اور مسلمان کے بڑے پرانے، بڑے گہرے اور بڑے اچھے تعلقات کی یاد تازہ کرتی ہے۔ اس کی ابتدا، اُس وقت سے ہوتی ہے جب ہندوستان کو پہلے پہل ہمسایہ اور دوسری اقوام سے سابقہ پڑا۔ دو اجنبیوں نے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی۔ سمجھنے ہی کی نہیں بلکہ دونوں نے ایک دوسرے سے نباہ کرنے میں اپنا اپنا فایدہ بھی دیکھا۔ یہ بات کہ ہم تمھاری سنیں اور سمجھیں اور تم ہماری سنو اور سمجھو اور ایک دوسرے کی رفاقت کرو، کسی کے رعب، دباؤ، رشوت یا عیاری سے نہیں حاصل ہوئی ورنہ آج جب ان سب کی گرم بازاری ہے ہم آپ کیوں ایک دوسرے کی نہ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں اور نہ ایک دوسرے کا منھ دیکھنا گوارا کرتے ہیں؟

حضرات، اُردو کچھ اس طور سے نازل ہوئی نہیں جیسے آسمان سے تارے ٹوٹ کر گرتے ہیں یا میدان جنگ میں ہوائی جہاز کی بے فوجیں اُتاری جاتی ہیں یہ تو ہمارے آپ کے صدیوں کے باہمی اختلاط کے بعد پیدا ہوئی۔ اس دوران میں ہم آپ زندگی کے اوراق پر حرف و معنی کی طرح ایک دوسرے سے وابستہ رہے مسلمان حاکم رہے اس میں شک نہیں، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اُنکی حکومت کبھی ایسی نہیں رہی کہ ہم کسی کے سامنے کسی طرح بھی شرمندہ ہوں اور یہ وہ امتیاز ہے جس کی دعویدار آج بھی شاید

ہی کوئی اور قوم یا حکومت ہو۔

اُردو ہندی سے نکلی ہی

زبان کے معاملہ میں مسلمانوں کی پوزیشن بالکل واضح ہے وہ اس کے موجد نہیں اس کے موید ہیں بحیثیت حکمراں اُنھوں نے اُردو، اس وقت تک منھ نہیں لگایا جب تک وہ اس کے قایل نہیں ہوگئے کہ یہ زبان رعایا کی سب سے زیادہ مقبول اور ترقی پذیر زبان تھی، اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اُن پر بڑا سنگین جرم عاید ہوتا کہ انھوں نے اپنی رعایا کی مقبول و مستند زبان کی توقیر نہ کی۔ جس زمانہ میں اُردو قلعۂ معلّیٰ میں داخل ہوئی اس زمانہ میں قلعہ سے باہر اُردو کے بعض چوٹی کے شعرا بڑی مشکل زبان میں شعر کہتے تھے لیکن خود بادشاہ، شاہزادے، متوسلین و مقربین، سہل اور سادہ اُردو کام میں لاتے تھے۔ ایک طرف بہادر شاہ اور مرزا فخرو اور دوسری طرف غالب اور مومن کے کلام کا مطالعہ کیجئے تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی۔ یہی نہیں بلکہ غالب جیسے ادق گو شاعر بھی قلعہ معلّیٰ میں داخل ہو کر سہل اور سادہ زبان پر اُتر آتے ہیں۔

دوسری بات جس کو مسلمان تسلیم کرتے آئے ہیں وہ یہ ہے کہ اُردو ہندی ہی سے برآمد ہوئی ہے اور اس کا ڈھانچہ ہندی ہی کی تیلیوں پر قایم ہے۔ البتہ عربی اور فارسی نے اس ڈھانچہ کو قوت ہی نہیں پہونچائی بلکہ اُس کو اس طور پر سدھارا اور سنوارا بھی ہے کہ وہ دوسری مستند زبانوں سے قریب تر ہوتی جارہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی ترقی اور قبول عام میں انگریزی ادب اور دیگر ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے اسالیب بیان نے بھی بڑی مدد پہونچائی ہے اگر یہ باتیں ہندی کے حامیوں کو ناگوار ہیں تو یہ اُن کی ناسمجھی ہے موجودہ ہندی بھی جسے اُردو کا حریف قرار دیا گیا ہے اس بات پر مجبور ہوئی کہ وہ سنسکرت سے استفادہ کرے۔ سنسکرت کی عظمت سے انکار نہیں۔ سوال اس کے صحیح مصرف کا ہے۔ سنسکرت سے بوجھل ہندی عوام پر نازل کیجا سکتی ہے، اُن سے منوائی نہیں جاسکتی میں ہندی پر اعتراض نہیں کرتا بلکہ اس کے کام کرنے والوں کے اُصول و طریقہ پر بحث کرنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے اس مسئلہ پر بحث کرنے کا مجھے حق بھی ہے اور میں اس کا اہل بھی ہوں اس لئے کہ میں ہندوستان کی سب سے زیادہ مقبول زبان کی ترقی و توسیع کا کام بھی کرتا ہوں اور ہندوستان کو اپنا وطن بھی سمجھتا ہوں۔ اُردو کا ہندی سے بڑا گہرا اور بڑا معنوی تعلق ہے۔ اس لئے ہندی کی نبض پر ہاتھ رکھے رہنا میرا فرض ہے۔ ہندی کے بے راہ ہونے کا اثر براہ راست اُردو پر پڑیگا جسکو ایک اچھا محب وطن کبھی گوارا نہ کریگا

مقبول عام ہندی اور نئی اُردو

صاحبو! میں ہندی کے کام کرنے والوں کو یہ نکتہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہندی کو مقبول عام بنانے کی صرف ایک صورت ہے یعنی اُسے ایک نئی اُردو کے قالب میں ڈھالا جائے۔ میرے اس بیان سے آپ گھبرائیں نہیں اور نہیں بھی نہیں گو ہنسنا گھبرانے سے بدرجہا بہتر چیز ہے۔ نئی اُردو سے میری مراد وہ زبان ہے جو ہمارے اُردو کے اُصول پر معرض وجود میں آئے یعنی وہ ضرورت، وہ عالی ظرفی، وہ ایثار و اخلاص وہ قوت ترک و اخذ اور تصرف و توازن کی وہ صلاحیت جس کے ماتحت اُردو عالم وجود میں آئی، ان سب کا بہم ہونا ضروری ہے اس کے بعد کوئی زبان وجود میں آسکتی ہے اور ترقی کرسکتی ہے ورنہ ظاہر ہے زبان بنائی جاسکتی ہے پیدا نہیں کیجا سکتی مسلط کیجا سکتی ہے، مقبول نہیں بنائی جاسکتی۔ اُردو جن راستوں سے گزری ہے اور جن جن زبانوں یا راستوں سے مستفید ہوئی ہے

اُنھیں سے ہندی کو بھی سابقہ پڑیگا اگر وہ ان کسوٹیوں پر آزمائے جانے کے لئے آمادہ نہیں ہے تو مجھے اس کے مستقبل کی طرف سے بہت اندیشہ ہے، مجھے یہ کہدینے میں بھی تامل نہیں ہے کہ ہندی ان راستوں سے گزرے گی تو لامحالہ اُردو کی شکل میں نمودار ہوگی اور ان راستوں سے گزرنے نہیں دیجائے گی تو اس کا انجام کچھ اور ہو تو ہو وہ ہرگز نہ ہوگا جس کی اس کے علمبردار توقع رکھتے ہیں!

نئی ہندی کے نئے دوستوں کو چاہئے کہ اسے سنسکرت سے بوجھل اور مضمحل کرنے کے بجائے اس میں ہندوستان کی موجودہ زبانوں کے الفاظ و اسباب منتقل کرنے کی کوشش کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ عربی فارسی سے لاگ ہے تو اسے نظر انداز کر دیں۔ اسکے بجائے بنگالی، مرہٹی گجراتی، تامل، تلگو، کنڑی یعنی ہندوستان کی زندہ عام زبانوں سے کام لیں۔ چونکہ ایسا نہیں ہو رہا ہے اس لئے ہندی کا پروپیگنڈا تو کامیاب ہو رہا ہے، خود ہندی کی عاقبت ابھی نہیں معلوم ہوتی۔ ہندی میں سنسکرت کی اندھا دھند آمیزش ہندی اور سنسکرت دونوں کے ساتھ بڑی ناسمجھی کا سلوک ہے۔

ہندی کا موجودہ چلن یہ ہے کہ اس میں سنسکرت کے الفاظ سموئے جا رہے ہیں اور عربی فارسی کے الفاظ جو زبان میں گھل مل گئے ہیں چن چن کر نکالے جا رہے ہیں یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ اس قسم کی غلطی مذہبی یا سیاسی جنون کے باعث ہو سکتی ہے یا پھر اسکا مرتکب وہ ہوگا جو زبانوں کی تاریخ اُس کے بولنے والوں کی ضرورتوں اور معمولی باتوں کے لئے غیر معمولی محنت سے بچنے کی فطری خواہش سے ناواقف ہوگا۔ یہ زبان اور اُس کے بولنے والوں کے ساتھ سخت ظلم ہے۔

صاحبو، جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے اُردو کی پیدائش اور ترقی میں ہندی اور ہندؤں کا بڑا حصہ رہا ہے اُردو ان دونوں کی احسانمند ہے۔ اس لئے اُردو کی ترقی کے مسایل پر جب آپ غور کریں تو ان دونوں کو پیش پیش رکھیں گو مجھے یہ کہنے میں بھی تامل نہیں ہے کہ نئی ہندی کے نئے پیرو کار جن راستوں سے جن طریقوں سے اور جس منزلِ مقصود کی طرف جا رہے ہیں وہ قومی اعتبار اور زبان کے نقطۂ نظر سے بالکل مناسب نہیں ہے۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ جب اُردو زبان بنی اور پھیلی پھولی، اُسوقت بھی ہندو مسلمان موجود تھے اور شاید آج کل کے ہندو مسلمانوں سے زیادہ پکے عقیدہ کے ہندو مسلمان تھے۔ وہ مذہب کے اعتبار سے کتنے ہی دور کیوں رہے ہوں انسانیت کے اعتبار سے بہت قریب تھے وہ ہندوستان کو آزاد کرانے کی فکر میں رہے ہوں یا نہیں ہندوستان کو مسلمانوں سے آزاد کرانے کی فکر میں ہرگز نہ تھے۔ وہ اُردو ہندی ہندوستانی کے مفہوم سے واقف تھے وہ زبان کو ترقی دینے کی فکر میں رہتے تھے۔ نئی زبان ایجاد کرنے کا انھیں کوئی خیال نہ تھا۔

مسلمانوں کے اقتدار و تسلط کی یادگار

ہندؤں نے اُردو کی بڑی خدمت کی ہے وہ اس زبان کے بڑے مستند شاعر اور ادیب رہے ہیں۔ آج بھی ہم میں بلند پایہ ہندو شعرا اور ادیبوں کی کمی نہیں ہے۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں جو اُردو کی حمایت میں بہت سے مسلمانوں سے آگے ہیں لیکن اُس رجحان کا کیا چارہ جو تنگ دل لیڈروں نے عوام میں پیدا کر کے ملک کی فضا کو اس قابل نہ رکھا کہ اس میں راحت و عافیت کے ساتھ کوئی بھلا مانس سانس لے سکے بعض بڑے سربرآوردہ صاحبان علم و منصب کا خیال ہے اور انگریزی اخبارات نے حسب دستور اس کی بڑی شد و مد سے

اشاعت کی ہے کہ "اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اور مسلمانوں کے اقتدار و تسلط کی یادگار ہے" لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ تو بتایئے کہ مسلمانوں کے اقتدار و تسلط کی یادگار قابلِ نفرت کیوں ہو؟ اقتدار و تسلط سے جبر و تشدد کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے لیکن تاریخ یا زبان کا کوئی طالب علم بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ اُردو زبان کے سلسلے میں مسلمان سلاطین نے کوئی ایسی بات بھی کی جس سے جبر و تشدد کا اظہار ہوتا ہو

صاحبو، تسلط و اقتدار کے ساتھ ساتھ احسان و برکت کے مفہوم پر بھی غور کیجئے، جسے آپ تسلط و اقتدار سمجھتے ہیں اُسی کو آپ احسان و برکت کے معنی بھی تو پہنا سکتے ہیں۔ سوال نقطۂ نظر کا ہے۔ الفاظ، جذبات، اسالیب، خلوص اور صناعت کاری کے اُس تاج محل کو جسے اُردو کہتے ہیں آپ مسمار کر دینا چاہتے ہیں تو پھر اینٹ پتھر، جسم و روح، تصورات و معتقدات علم و فن فیض و برکت کے اُن تمام تاج محلوں کو بھی مٹا دیں جس سے یہ سرزمین بھری پڑی ہے۔ پھر زندگی کا کون سا شعبہ ہے جس پر مسلمانوں نے اپنے برکات کے نقوش نہیں چھوڑے ہیں اور یہ کچھ ہندوستان ہی پر موقوف نہیں ہے۔ متمدن دنیا کا کون سا حصہ ہے جس پر مسلمانوں کے دستِ بازو یا ذہن و فکر کا نقش نہ قایم ہو۔ یہ نقوش کون مٹا سکتا ہے۔ ان کو مٹانا بھی نہ چاہئے یہ نقوش ہر نقش میں خود بخود نمایاں ہونگی اگر نمایاں نہ ہوں تو سمجھنا چاہئے کہ جس متن پر یہ نقوش نمایاں نہیں ہیں وہ متن بجائے خود نقش برآب ہے!

علوم و فنون، تہذیب و اخلاق، شہامت و صداقت کی یادگاروں کو مٹانے والے کو آپ جانتے ہیں دنیا کن ناموں سے یاد کرتی آئی ہے!۔ عزمِ صمیم، کارِ عظیم، اور لطفِ عمیم ایسی چیزیں نہیں ہیں جنھیں کوئی مٹا سکے!

صاحبو، اس سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رکھئے کہ "الگ تھلگ رہنے اور رکھنے" کے اُصول نے اس ملک کو بڑے نقصانات پہونچائے ہیں۔ اسی دیرینہ تفریق کا نتیجہ ہے کہ وہ لوگ جو اب تک تہذیب و تمدن کی برکتوں سے محروم رکھے گئے اب منت سماجت کے باوجود آپ کے گروہ میں شامل نہیں ہوتے۔ وہ زمانہ اور تھا اور یہ زمانہ اور ہے۔ پاکستان کی تحریک اسی ناعاقبت اندیشانہ طرزِ عمل سے وجود میں آئی۔ میں پاکستان کا قایل نہیں ہوں لیکن میں نے اُن واقعات و میلانات کا مطالعہ کیا ہے جو لازماً اس قسم کی تحریکوں کا باعث ہوتے ہیں آپ نے اپنوں ہی سے نفرت کر کے ہریجن ہند کی بنیاد رکھی۔ اس آفت میں آپ مبتلا تھے ہی کہ آپ نے "مسلم ہند" کے امکانات کا اس میں اور اضافہ کر دیا۔ اسے ہندو مسلمان دونوں خوب یاد رکھیں کہ زیگفرڈ لائن اور مشیر نو لائن بنا کر وہ جنگ تو کر سکتے ہیں اعتماد و عافیت کبھی نہیں حاصل کر سکتے۔ کچھ اور نہیں تو مسلمانوں کا یہ احسان تو ہندوستان ہمیشہ یاد رکھے گا کہ انھوں نے ہندوستان کے بے شمار، دور از کار اور نافرجام زیگفرڈ اور مشیر نو لائنیں مٹا دیں۔ مسلمان اور ان کا مشن اس قسم کی لائنوں کے خلاف ہے اور اس نے ہمیشہ اس کے خلاف جد و جہد کی ہے!

اندھے کی لاٹھی، ہندوستانی

صاحبو، اُردو ہندی کے ساتھ ایک لفظ ہندوستانی بھی بطور "فدوی" شامل ہو گیا ہے۔ فدوی سے مراد یہاں واحد متکلم نہیں ہے۔ آپ کو شاید یاد ہو سورج اور چندر گرہن کے سلسلہ میں ایک بڑی دلچسپ روایت آبِ حیات حاصل کرنے اور پینے کی ہے۔ دیوتاؤں کی جماعت میں مٹر آ ہو کس طرح داخل ہو گئے تھے اور اُن کا کیا انجام ہوا یہ سب آپ کو معلوم ہوگا۔ یہی حال اُردو ہندی اور دیگر زبانوں کے درمیان

اس ہندوستانی کا ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے، بالخصوص لیڈروں کی زبان پر، یہ جتنا معصوم معلوم ہوتا ہے اتنا ہی مفہوم و مقصود کے اعتبار سے نامعقول ہے۔ یہ اندھے کی لاٹھی ہے یعنی اُس سہارے کا کام بھی دیتی ہے جس کا اندھا محتاج ہوتا ہے اور اندھے کی اُس ترنگ کو بھی پورا کرتی ہے جب وہ لاٹھی کے سہارے چلنے کے بجائے اُسے چلانے لگتا ہے!

حضرات! اُردو، ہندی، ہندوی، ہندوستانی ایک ہی زبان اُردو کے مختلف نام ہیں۔ اس کے تاریخی ثبوت موجود ہیں۔ اس پر خوب بحث ہو چکی ہے، میں اُن کو دُہرانا نہیں چاہتا۔ البتہ اتنا یاد رکھئے کہ یہ وہ زبان ہے جو شمالی ہند میں بولی جاتی ہے اور دوسرے مقامات پر سمجھی جاتی ہے۔ اُردو کے حمایتی اسے ہندی کہتے ہیں۔ سارا جھگڑا اسی ایک محبوب کے دو چاہنے والوں کے سبب سے پیدا ہوا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اگر ہم یہ مان لیں کہ اچھا یہی ہندوستانی ہندی ہے تو پھر ہندی کے نام سے ایسی زبان کیوں پیش کی جاتی ہے جو نہ شمالی ہند میں مقبول ہے اور نہ عام طور پر بولی جاتی ہے اور نہ دوسرے مقامات پر سمجھی جاتی ہے؟ یہی سبب ہو کہ ہندوستانی کے لئے کبھی ہندی ہندستانی" کا فقرہ استعمال کیا جاتا ہے کبھی "ہندستانی ہندی" کا لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ فارمولے ایسے گریزپا ہیں کہ نہ تو ہمارے قابو میں آتے ہیں اور نہ ہم اُنکے قابو میں!۔ اس بحث کو ختم کرتے کرتے میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہندستانی معمولی روزانہ کی بات چیت کی زبان ہے جو مختلف تبدیلیوں کے ساتھ مختلف مقامات پر اظہار خیال کا وسیلہ بن گئی ہے۔ یہ تصنیفی زبان نہیں ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی کی بدنامی یا ناکامی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہندوستان کی تصنیفی زبان ہونے کے امکان کو امر واقعہ تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن جب علمی دقتیں اور جماعتی تنگ نظری سامنے آئی تو کسی کی ایک پیش نہ گئی۔ درحقیقت اس لفظ ہندوستانی کو (جہاں تک تصانیف کا تعلق ہے) مجاز کے طور پر نہیں بلکہ بطور معیار کے پیش نظر رکھنا چاہئے تھا یعنی اُردو لکھنے والے سہل سے سہل اور اسی طرح ہندی کہنے والے سہل سے سہل ہندی لکھنے کی کوشش کریں۔ مجھے سرولیم میرس سابق گورنر صوبہ متحدہ کا یہ فقرہ کبھی نہیں بھولتا کہ ہر ہندی داں کا حق ہے کہ اسے اُردو سمجھنے دیا جائے۔ بالفاظ دیگر ہندی کے برتنے والے کے مدنظر یہ ہونا چاہئے کہ اس کی تحریر سے اُردو داں بھی مستفید ہونے کا حق رکھتے ہیں اور اُردو کے ہر لکھنے والے کے پیش نظر یہ ہونا چاہئے کہ ہندی داں بھی اسکی تحریر سے فایدہ اُٹھانے کا حق رکھتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو رفتہ رفتہ ایک مشترک زبان وجود میں آ جائے گی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس سچے اور اچھے اُصول کو کون منوائے گا اور کون مانے گا، اس کا جواب میں تو یہی دے سکتا ہوں کہ آپ نوجوان اسے مانیں گے اور آپ ہی نوجوان اسے منوائیں گے اگر ایسا ہونا ناممکن ہے تو پھر غالباً یہ بات ہوگی کہ ابھی ہم پر ایسا کوئی حادثہ نازل نہیں ہوا ہے جس کے ہم واقعی سزاوار ہیں جس کے بعد ہم وہ سب کچھ مان لیں گے جو اب نہیں مانتے۔

موجودہ ہندی دراصل جدید سنسکرت ہے

حضرات میرا خیال ہے کہ اُردو سے ہندوؤں کو اور ہندی سے مسلمانوں کو بدکنے اور بیزار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مسلمانوں سے قطع نظر یہ تو دیکھئے کہ اُردو نے کبھی بھی اپنے دیرینہ محسن ہندوؤں کی خدمت کرنے میں کوتاہی کی؟ خود ہندو علماء و اکابر نے اپنے مذہب حکمت، اخلاق شاعری سب کی اشاعت و ترقی میں اُردو کو وسیلہ بنایا اُردو ہی نے ہندی کا تعارف تمام ہندوستان سے کرایا!

آج بھی غیر مسلم صاحبان فکر اور ارباب قلم کی اُردو ویسی ہی خدمت کر رہی ہے جیسا کبھی پہلے کر چکی ہے۔ یہ باتیں محض لطف سخن کے سلسلہ میں میں نہیں عرض کر رہا ہوں وقت تنگ ہے ورنہ میں اپنے اور آپ کے کرم اور فاضل بزرگ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کے معرکۃ الآرا مقالہ "اُردو ہماری زبان" کے وہ جستہ جستہ اقتباسات آپ کو سناتا جہاں موصوف نے اُردو کے احسانات ہندوؤں پر اور ہندوؤں کے احسانات اُردو پر تاریخی شواہد کے ساتھ بیان کئے ہیں!

دوسری بات جو میں آپ سے خاص طور پر عرض کرنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ ہندی سے آپ خواہ مخواہ نہ ڈریں نہ بدظن ہوں معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اُردو ہندی ہی سے برآمد ہوئی ہے۔ اس کی نہاد ہندی ہی ہے۔ اُردو، ہندی ہی کی ترقی یافتہ اور شائستہ صورت ہے لیکن اُس ہندی کی ترقی یافتہ اور شائستہ صورت ہے جو نواح دہلی کے عوام کی بولی تھی، جس زبان میں وہ رنج و راحت یا اپنی مختصر ضروریات کا اظہار کرتے تھے۔ پریم کے گانے گاتے تھے اور پالن ہار کی بڑائی کرتے تھے وہ ہندی ہرگز نہیں جس میں آجکل بلا لحاظ موقع و محل لیڈر تقریریں کرتے پھرتے ہیں اور اس کا مطلق لحاظ نہیں کرتے کہ ہوائی چھتریوں کے ذریعہ سپاہی تو اُتارے اور سرنگیں تو بچھائی جا سکتی ہیں، الفاظ و عبارت اور اُن کے مفہوم دلوں میں ہرگز نہیں اُتارے جا سکتے۔ بذات خود میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ موجودہ ہندی کو اصلی و قدیم ہندی سے کوئی نسبت نہیں۔ اسے تو جدید سنسکرت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

صاحبو، ابھی ابھی میں نے ایک روایت بیان کی تھی کہ اُردو ہندی نژاد ہے اس سے ممکن ہے آپ کو کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی ہو۔ اس لئے میں صرف اس کی تصریح کر دینا چاہتا ہوں۔ اُردو ہندی سے ماخوذ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ہندی کے مقابلہ میں اُردو کی حیثیت محض ضمنی ہے۔

بذات خود میں تو کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اُردو ہندی کے بطن سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ خود ہندی میں ایک اولوالعزم، سیر چشم اور ملنسار قوم کا خلوص و شعور، متعدد و مختلف بیدار و برسر کار زبانوں کا فیضان و فعالی ملک کی صحیح و صالح طلب اور اسی ملک کے رہنے بسنے والوں کی یکجہتی و حسن و مفاہمت نے ٹھیک وقت اور ٹھیک موقع پر ایک نشاۃ الثانیہ کی طرح ڈالی اور یہ ہندی کا نشاۃ الثانیہ تھا جو اُردو کے تاج محل میں جلوہ گر ہوا۔

اس مسئلہ کی وضاحت بڑا وقت چاہتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ایک خالص علمی مسئلہ کی وضاحت میں آپ کو دیر تک بٹھا رکھوں، غالباً اتنا اشارہ کر دینا یہاں کافی ہوگا کہ بعد کی مختلف قوتوں نے جو وقتاً فوقتاً اُبھرتی رہیں یا اُبھاری گئیں اس عجیب و غریب تحریک کو صحیح راستہ پر رواں رہنے سے روک دیا۔ لیکن اس بحث کو یہاں ختم کیجئے۔

عالی ظرف اور ہمہ گیر زبان

اُردو خالص اپنے دیس کی چیز ہے۔ اس لئے اسے دیس ہی میں بدیس نہ ہونے دینا چاہئے۔ ہمارے دیس ہی میں کس چیز کی کمی ہے جو ہم خواہ مخواہ مایوس یا شرمندہ ہوں اُردو میں ہر زبان ہر تحریک اور ہر تجربہ کی گنجائش ہے لیکن اس گنجائش کو سمجھنے تولنے اور پرکھنے کے لئے محنت، دیانت، وسعت نظر، اور قابلیت کی ضرورت ہے۔ زبان و ادب کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھنے چاہئیں لیکن احتساب اُٹھانا چاہئے

یہ بھی یاد رکھئے کہ زبان و ادب اپنے محتسب اور امین خود پیدا کرتے رہتے ہیں اس کے نہ اجارہ دار ہوتے ہیں اور نہ اسکی خانقاہیں ـــ دروازے کھلے رکھئے لیکن پاسبان ضرور رکھئے!

حضرات! زبان کی کامیابی کا مدار بالعموم دو چیزوں پر ہوتا ہے یعنی اسے عام طور پر لوگ کہاں تک بولتے سمجھتے اور کام میں لاتے ہیں، دوسرے یہ کہ خواص یعنی ادیب، شاعر، مفکر اور ثقہ اسے کیا درجہ دیتے ہیں اور اس سے کیا اور کہاں تک کام لیتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں واضح ہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے اُردو ادب اب بھی ہندوستان میں ہر زبان سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اور انگریزی کے علاوہ ہندوستان کی تمام مروجہ زبانوں سے زیادہ یہ ہندوستان سے باہر بھی مقبول و مروج ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ خواص کی تقریباً اُن تمام ضرورتوں کو پورا کرتی ہے جس کا اُس سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اُردو اشعار یا مشاعرے کتنے ہی ناپسندیدہ کیوں نہ ہوں، عوام اور خواص دونوں اُردو کلام پر وجد کرتے ہیں۔ ہماری ذہن و فکر کا وہ بہت دور تک ساتھ دیتی ہے۔ غیر زبان کو اُردو میں منتقل کرنے کے لئے جن باتوں کی ضرورت یا جن شرائط کی پابندی لازم آتی ہے اُردو بڑی حد تک ان کو پورا کرتی ہے اس میں صلابت، نزاکت، لطافت، رعنائی، وسعت، وزن، عمق، بلندی تنوع اور توازن سبھی کچھ ہے، یہ بڑی عالی ظرف اور ہمہ گیر زبان ہے۔ اس کا ثبوت آپ کو ہر موقع پر ہر وقت ملسکتا ہے اس میں جتنے اچھے سچے اور بے شمار سانچے ہیں۔ اس کا مجھے خوب اندازہ ہے، آپ میں سے بھی بہتوں کو ہوگا۔ یہ برکت ہے اُن برگزیدہ ہستیوں کی اور اُن برگزیدہ مقاصد کی جنکی یادگار ہماری آپ کی یہ اُردو زبان ہے۔ اس کہنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ آپ مطمئن ہو جائیں اور کوشش سے ہاتھ اُٹھالیں۔ اُردو نرغہ میں ہے اور ایسی ایسی قوتیں مخالفت میں برسرِ کار ہیں جن کا صحیح اندازہ ہم آپ نہیں کر سکتے، آپ تو شاید یہ بھی اندازہ نہیں کر سکتے کہ خود ہم آپ اُردو کی حمایت میں دوسروں سے کتنے پیچھے ہیں اور اگر ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب المخاطب بہ اُردو یار جنگ، اُردو کے دیرینہ محسن و مایۂ ناز محقق و ادیب نے یہ نہ کہدیا ہوتا کہ "ہم بھی بیٹھے نہیں ہیں،، تو میں پیچھے کے ساتھ بیٹھے کا اضافہ ضرور کر دیتا۔

مولانا ابوالکلام کی زبان

صاحبو! حال میں ایک اخباری بحث کا بغور مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ اخباری بحث کا بغور مطالعہ کرنا دانشمندی کی بات نہیں ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں ہمیشہ دانشمندی ہی کی بات کرتے رہنے یا کئے جانے سے عمر کم اور حلیہ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ دعوی یہ کیا گیا تھا کہ مسلمانوں نے عمداً اُردو سے ہندی کے الفاظ خارج اور عربی فارسی کے الفاظ داخل کئے۔ اس طور پر اُردو مسلمانوں سے قریب اور ہندؤں سے دور ہو گئی۔ اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی مثال خاص طور پر پیش کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ متروکات کے اصول پر بھی بحث کی گئی تھی اُردو کو شک کی نگاہ سے دیکھنے والوں کی نظر مولانا ابوالکلام کی تحریروں پر خاص طور پر پڑتی ہے۔ اس لئے اس مسئلہ کو سب سے پہلے واضح کر دینا بہت ضروری ہے۔ اول تو یہ کہ مولانا آزاد ایک خاص قسم کے اسلوب و انشاء کے مالک ہیں۔ اُن کا فارم (اسلوب) اور ان کا میٹریل (مواد) دونوں مخصوص انداز کے ہیں، جن پر آپ کوئی عمومی حکم نہیں لگا سکتے

مولانا ابوالکلام نے جسوقت لکھنا شروع کیا اُسوقت مسلمانوں پر جنگ بلقان، جنگ طرابلس اور آخر میں ٹرکی کے شریک ہو جانے سے جنگ عظیم کے باعث ایک عجیب ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ مولانا آزاد اسلامی حکومتوں اور اسلامی اداروں کو پامال اور فنا ہوتے دیکھ رہے تھے اور وہی نہیں تقریباً ہر مسلمان یاس و اضطراب کے عالم میں مبتلا تھا۔ مولانا کے مخاطب صرف مسلمان تھے جن کی ذہنی کیفیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے لازمی تھا کہ وہی کلمات، وہی باتیں اور وہی روایات مدنظر رکھی جاتیں اور وہی انداز اور وہی لب و لہجہ اختیار کیا جاتا جو مسلمانوں کے دلوں کو گرما یا برما سکتا۔ مولانا کو اسوقت مسلمانوں ہی کو سہارا دینا تھا اور اُنھیں سے سہارا پکڑنا مقصود تھا۔ اُن کے مخاطب اُس وقت نہ اُردو داں تھے نہ ہندی داں بلکہ صرف مسلمان تھے جن میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے وہ اپنی خطابت اور عربی کی جزالت سے کام لینا ضروری خیال کرتے تھے اس لئے اُن کی اُس وقت کی تحریروں سے سند پکڑنا صحیح نہیں ہے دوسری طرف جب وہ دور گزر گیا اور نان کو آپریشن کا زمانہ آیا تو اُنھوں نے اپنی تحریر کا رنگ یک لخت بدل دیا اس وقت ان کے مخاطب ہندوستان کے سارے باشندے ہیں اس لئے اُن کی تحریریں بھی سلیس سادہ اور ہلکی پھلکی ہوتی ہیں۔ مسئلہ بالکل واضح ہے مولانا نے جو کچھ کیا وہ کبھی اس لئے نہ تھا کہ وہ ہندی کو پامال اور اُردو کو ترقی دینا چاہتے تھے۔ ایسا ہوتا تو آخر آج کونسی چیز مانع ہے کہ وہ اپنا پہلا اسلوب اختیار نہ کریں؟

ہندی الفاظ کو نکالنے کا اعتراض

اب رہا بعض ہندی الفاظ کا نکالا جانا اور اُن کی بجائے فارسی الفاظ کا دخل پانا۔ یہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بعض ہندی الفاظ اور ترکیبوں کو خواہ مخواہ متروکات کی فہرست میں داخل کیا گیا۔ لیکن یہ کسی منظم تحریک کے باعث نہ تھا اس سے آپ اُردو کے بعض اساتذہ کا دامن پکڑ سکتے ہیں، من حیث الکل تمام مسلمان اُردو دانوں کو مورد الزام نہیں قرار دے سکتے۔ لیکن انصاف شرط ہے۔ الفاظ ہندی کے ہوں یا عربی فارسی کے زبان سے ہمیشہ نکلتے بھی رہیں گے اور شامل بھی ہوتے رہیں گے۔ شایستگی کے مختلف مراحل طے کرتے ہی ہندی نے جب اُردو کی اور اُردو نے ایک مستند اور مقبول زبان کی حیثیت اختیار کی تو زبان دانوں کے سامنے — اور اس میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے، وہ تمام مسایل آئے جو ایسی حالت میں ضرور پیش آتے ہیں۔ کون سے الفاظ کیسے ہیں۔ اُنکو خراد پر چڑھا کر موزوں اور سڈول بنا لینا چاہئے یا یکقلم نکال دینا چاہئے۔ ان کا زبان سے میل ہے یا نہیں، وہ ٹکسالی بنائے جا سکتے ہیں یا نہیں، امتداد زمانہ یا ترقی افکار کے فشار سے وہ قایم رہیں گے یا نہیں، زبان کو آیندہ جن مطالبات کو پورا کرنا پڑے گا اُسکے لئے کس قسم کے ذخیرے یا کس طرح کے اُصول وضع کرنے چاہئیں۔ یہ مسایل اُردو کے فضلاء کے سامنے آئے اور انھوں نے جہانتک ہو سکا اُردو کو اس قابل بنانے کی کوشش کی کہ وہ مستند زبانوں کی صف میں جگہ پا سکے۔ ہندی کو جو حیثیت ابتدا میں تھی اس سے ہم سب واقف ہیں۔ وہ خود علمی یا ادبی زبان بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ اس لئے دوسری زبانوں سے مدد لی گئی۔ اعتراض کرنے والے صاحب نے یہ نہیں دیکھا کہ آجکل بھی اُردو کے اسالیب برتے جا رہے ہیں اور نئے نئے الفاظ اور ترکیبیں بڑی کثرت سے داخل ہو رہی ہیں۔ حیدرآباد، پنجاب اور ترقی پسند مصنفین کی مطبوعات کا آپ غور سے مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا۔

اُردو کے اسالیب بیان ہی نہیں بدلتے جا رہے ہیں، بلکہ سائنس، تنقید، افسانہ اور اس قبیل کے دیگر موضوعات نے اُردو میں فنی اصطلاحی اور ادبی الفاظ کی بھرمار کر دی ہے اور ہر طرح کے الفاظ و فقرے اُردو میں بڑی تیزی کے ساتھ داخل ہوتے جا رہے ہیں۔

فتنہ پرداز آئی سی ایس

حضرات! گزشتہ مہینہ کے آخری ہفتہ میں صوبہ ہذا کے مشہور انگریزی روزنامہ لیڈر میں نینی تال کے ایک نامہ نگار کا نوٹ شایع ہوا ہے کہ یوپی سکریٹریٹ کے ہندی ساہتیہ سنگ کا ایک غیر معمولی جلسہ شریجت سی بالکرشن راؤ آئی سی ایس کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں آل انڈیا ریڈیو دہلی کے اس رویہ پر اظہار افسوس کیا گیا تھا کہ جس قسم کی ہندوستانی زبان وہاں استعمال کی جاتی ہے اُس میں غیر مانوس بدیسی الفاظ بالخصوص عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے — اس کے بعد آگے چل کر کہا گیا کہ آل انڈیا ریڈیو کی یہ پالیسی نہ صرف ہندی کو بے پناہ نقصان پہونچا رہی ہے، بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو ان لوگوں کا بالکل لحاظ نہیں رکھتا جن کے لئے وہ قائم کیا گیا اور جن کی وسیع اکثریت ہندی بولنے والی تھی — آخر میں یہ نوٹ تھا کہ حاضرین میں مسٹر کے بی بھاٹیا آئی سی ایس ڈپٹی کمشنر سیتاپور اور ڈی ان جھا آئی سی ایس ڈپٹی سکریٹری صنعت و حرفت اور بعض دیگر عمائدین تھے۔

اس نوٹ پر لیڈر کے اڈیٹر نے ایک مستقل نوٹ میں اپنی جو رائے سپرد قلم فرمائی ہے اُس کا خلاصہ بھی سنئے:۔ "ہم کو اکثر ایسی شکایات موصول ہوئیں کہ آل انڈیا ریڈیو سے خالص وہ بھی مشکل قسم کی اُردو میں خبریں نشر کی جاتی ہیں جسے عام طور پر ہندی جاننے والے نہیں سمجھ سکتے"۔ (اس تمہید کے بعد نینی تال کے متذکرہ صدر نوٹ کا حوالہ دیا گیا ہے اور پھر جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اُن کے جستہ جستہ اقتباسات حسب ذیل ہیں)

"یہ ہندی کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے جو ہندوستان کی تمام دوسری زبانوں سے زیادہ بولی جاتی ہے۔۔۔۔ ہم کو اُردو سے کوئی مخاصمت نہیں ہے ہم کو اس کی خوشی ہوگی اگر وہ بھی اپنی دوسری بہنوں کی طرح اپنے خاص حلقہ میں ترقی کرے۔۔۔ چونکہ اس سنگ میں خالصتاً گورنمنٹ کے حکام شامل ہیں۔ چونکہ اس کی صدارت ایک سویلین نے کی۔ چونکہ غیر اراکین میں جن لوگوں نے اس کی تائید کی اُن میں ایک ڈپٹی کمشنر اور الہ آباد یونیورسٹی کے صدر ہیں اور چونکہ رزولیوشن کے الفاظ ایسے ہیں جن پر اُردو کا کوئی بھی خواہ کسی طرح معترض نہیں ہو سکتا اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جلسہ میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کے بارہ میں کہا جا سکے کہ کسی شرارت یا غیر ذمہ دارانہ جذبہ سے متاثر ہو کر آل انڈیا ریڈیو کو پریشان کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ شکایت بالکل بجا ہے، چنانچہ حکام کو چاہئے کہ اس کا جلد سے جلد تدارک کریں۔

حضرات: جن اسباب کی بنا پر جو نتائج نکالے گئے ہیں اُن پر ذرا غور فرمایئے۔ میں اُن کی تشریح نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ کچھ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں پہلا سوال یہ ہے کہ کیا اڈیٹر لیڈر کا یہ کہنا صداقت، انصاف اور خلوص پر مبنی ہے کہ:۔ "ہم کو اُردو سے کوئی مخاصمت نہیں ہے۔ ہم کو اس کی خوشی ہوگی اگر وہ بھی اپنی دوسری بہنوں کی طرح اپنے خاص حلقہ میں ترقی کرے"؟ دوسرا سوال یہ ہے کیا حکومت کے مقتدر حکام کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ ہندی اُردو کے مسئلہ میں منظم جماعتی پاسداری کا یوں

کھلم کھلا مظاہرہ کریں ؟ —— تیسرا سوال یہ ہے کہ جب ایسے ایسے بارسوخ وصاحب اقتدار حکام منظم ہو کر کسی مسئلہ پر اس شدومد کے ساتھ علی الاعلان اپنی پاسداری کا اعلان کریں گے تو آل انڈیا ریڈیو ہی کیا حکومت کا کوئی ادارہ خواہ وہ پولیس ہو، فوج ہو، عدالتہائے دیوانی وفوجداری ہوں، محکمہ تعلیم یا کوئی اور محکمہ ہو، انصاف ویکسوئی کے ساتھ اپنے فرائض بجا لاسکے گا، اور وہ لوگ عزت، عافیت اور آزادی سے رہ سکیں گے جو ان حکام کے ملت یا مسلک سے علٰحدہ ہوں ؟ —— چوتھا سوال یہ ہے کیا یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ مقتدر حکام کی یہ جماعت جسے ہندی بتاتی ہے وہی ہندی ہندوستان کی بیشتر آبادی کی زبان ہے اور اس زبان سے انحراف کرنا یا اس سے مختلف زبان استعمال کرنا آل انڈیا ریڈیو کا سب سے بڑا جرم ہے ؟ —— پانچواں سوال یہ ہے کیا با اختیار ومقتدر حکام وارباب حکومت کی یہی تنگدلی اور تنگ نظری نہ تھی جس کی بنا پر گزشتہ دور حکومت میں اُردو ہندی کے مسئلہ پر اُردو کے بہی خواہوں کو سخت شکایت اور بددلی کا موقع ملا تھا جس کے وہ آج تک شاکی ہیں ؟ —— چھٹا سوال یہ ہے کیا صوبہ کی موجودہ حکومت اپنے سربرآوردہ حکام کی اس منظم جماعتی پاسداری کو پسندیدہ نگاہ سے دیکھتی ہے اور کیا وہ گوارا کرے گی کہ اس طرح کے دوسرے سخت متنازعہ فیہ مسایل پر اس کے دوسرے حکام اسی طرح کارروائی عمل میں لائیں ؟ —— ساتواں سوال یہ ہے کیا آل انڈیا ریڈیو سے اچانک کوئی ایسی مجرمانہ بے عنوانی سرزد ہوئی تھی کہ سنگ کا نینی تال میں غیر معمولی اجلاس کیا جاتا شری جیت سی - بالکرشن راؤ آئی سی - ایس اس کے صدر ہوتے اور فی الفور، لیڈر جس کی پالیسی کے سب سے بڑے کرتا دھرتا لبرلزم کے مسلمہ لیڈر سر سی، وائی چنتامنی ہیں، اپنے اڈیٹوریل کالم سیاہ کر دیتا ؟ —— یہی لبرلزم ہے؟ اسی کو صحافتی دیانتداری کہتے ہیں ؟

کام کی باتیں حضرات، یہ باتیں تو کب سے ہوتی آرہی ہیں اور معلوم نہیں کب تک جاری رہیں گی - اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہئے - ہم کچھ کرنا بھی چاہتے اور کچھ کر بھی سکتے ہیں - ظاہر ہے ہم جانتے سب کچھ ہیں، چاہتے سب کچھ ہیں، کر بھی بہت کچھ سکتے ہیں —— لیکن کریں گے کچھ نہیں - پوزیشن یہ ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھئے کہ زمانہ وہ ہے جب آپ کو کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا - خواہ آپ پسند کرتے ہوں یا نہیں، خواہ آپ میں سکت ہو یا نہ ہو!

ایسی صورت میں بہتر یہ ہوگا کہ ہم چند عقاید اور اُصول متعین کر لیں اور اپنا عملی پروگرام مختصر رکھیں اور یہی وہ مقامات ہیں جہاں مجھ میں آپ میں اختلاف بھی پیدا ہو سکتا ہے اور ہم آپ ایک دوسرے کے معاون ومددگار بھی بن سکتے ہیں اس لئے اُن پر خلوص اور سکون کے ساتھ غور فرمائیے -

۱ - آپ کے اُصول اور عقیدہ کی بسم اللہ اس سے ہونی چاہئے کہ مادری زبان میں صحت وسہولت سے گفتگو کرنا اور اپنے بہترین خیالات کو بہترین اسلوب سے ظاہر کرنے کی قدرت رکھنا آپ کا فرض ہے اور فرض سے عہدہ برا ہونا نعمت ! اس کو آپ اپنا ذاتی اور قومی امتیاز سمجھیں نہ کہ ننگ جیسا کہ اب تک سمجھتے رہے ہیں - اگر آپ کا دل اس عقیدہ پر نہیں جمتا تو خواہ مخواہ دھوکہ دینے اور ہنگامہ مچانے سے باز آجائیے -

دوسرے یہ کہ اُردو یا اسلام کو چھوئی موئی مت سمجھئے۔ مدتوں کی غفلت اور بزدلی نے ہم میں خواہ مخواہ چیخنے اور مدد مانگنے کی بدعادت پیدا کردی ہے آپ یقین مانیں جب ہم اسلام اور اُردو کے لئے چیخنے چلاتے ہیں تو ہماری ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ اسلام یا اُردو نہیں، بلکہ ہم خطرہ میں ہیں۔ ایسی حالت میں اسلام یا اُردو کو بیچ میں لانا بڑی نالائقی ہے۔ اس بدعادت سے ہم نے اپنی استعداد کار مضمحل کردی ہے اور دوسروں کی نظر میں سبک ہوچکے ہیں۔ اسلام یا اُردو کو سپر نہ بنایئے بلکہ اُن کے سپر خود بنئے۔ آپ ایسا کریں گے تو آپ کی آواز میں اثر اور آپ کے عمل میں قوت پیدا ہوگی۔

تیسرے یہ کہ اُردو کی حمایت میں آپ خواہ مخواہ سیاسی یا مذہبی جذبات سے مغلوب نہ ہوں اُردو محض مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ یہ ہمارے ہموطنوں کی بھی زبان ہے اُردو کی حمایت جماعتی نہیں وطنی مقاصد کو پیش نظر رکھکر کرنی چاہئے دیسی بدیسی کسی زبان سے آپ کو برہم یا بدظن نہیں ہونا چاہئے۔ اُردو کی تاریخ گواہ ہے کہ ہر زبان سے نئی زندگی حاصل کرتی رہی ہے اور ہر تحریک سے مستفید ہوئی ہے۔ آپ اس کو تمام ہندوستان کی مشترک زبان بنانے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ہندوستان کی زبانوں یا ان کے بولنے والوں سے خوفزدہ کیوں ہوں؟ اس طریقہ کار اور وسعت نظر سے آپ میں بڑے اچھے لکھنے والے پیدا ہوں گے۔ آپ کی زبان نت نئی خوبیوں کی حامل بنتی جائے گی اور آپ کے ساتھ کام کرنے والوں کی تعداد ترقی کرتی رہے گی۔

چوتھی بات یہ ہے کہ سہل اور بامعنی اُردو لکھنے کی کوشش کیجئے۔ ادبی بازیگری یا مشاطگی کی اب نہ فرصت ہے نہ مانگ۔ کبھی اس کا بھی زمانہ تھا۔ یہ زمانہ فراغت کا نہیں مقابلہ کا ہے۔ بازار میں نئی، اچھی اور کارآمد چیزیں بکثرت آرہی ہیں۔ آپ بھی نئی اچھی اور کارآمد چیز پیش کیجئے۔ بھیگ مانگنے، جیب کترنے یا ڈاکا ڈالنے کا کوئی نتیجہ نہیں یہ بھی یاد رکھئے کہ مقابلہ ایسا سخت ہے کہ آپ کا مال اُنیس ہوگا تو اسے آدھے دام پر بھی کوئی نہیں پوچھے گا آپ امتحان کرکے دیکھئے اُردو ایسی سچی، اچھی اور متنوع زبان ہے کہ آپ سیدھی سادی عبارت میں بھی زور اور بانکپن پیدا کرسکتے ہیں۔ میں آپ سے تجربہ کی بات کہتا ہوں، تمرد یا تمسخر کی نہیں۔ میرے نزدیک یہ بنیادی عقاید ہیں جن پر اُردو کے ہر حمایتی کو عمل کرنا چاہئے۔

صاحبو - اس سے پہلے میں عرض کرچکا ہوں کہ ہم کو ابتدا میں عملی کام کا پروگرام مختصر رکھنا چاہئے، تاکہ اس پر آسانی سے عمل ہوسکے اس پروگرام کو میں دو حصوں میں تقسیم کروں گا ایک علمی دوسرا تبلیغی۔

علمی کے سلسلہ میں فی الحال اور اس کانفرنس کی یادگار میں میں چاہتا ہوں کہ آپ بریلی کالج میں اُردو کے ایم۔اے کلاس کھلوانے کی کوشش کریں۔

تبلیغی جزو کے سلسلہ میں میں عرض کروں گا کہ آپ اپنے آپ کو انجمن ترقی ہند دہلی سے وابستہ کریں۔ اس انجمن کے قابل فخر کارنامے ہم سب کو معلوم ہیں۔ ہندوستان بھر میں اس کی ساکھ قائم ہے اور اسکی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں اور نہایت قابل قدر خدمات بجا لارہی ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب براہ راست ان شاخوں کی خدمات اور ان کی مختلف ضروریات پر نظر رکھتے ہیں۔

حضرات! اشارۃً ایک بات اور کہدینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کانگرسی حکومت سے مسلمانوں کے سوءظن کا سب سے بڑا سبب یہ رہا کہ زبان کے مسئلہ میں حکومت نے بڑی تنگ نظری اور بے عقلی سے کام لیا۔ اس سے مسلمانوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی (جس کا نکالنا مدتوں ناممکن رہے گا) کہ کانگرسی حکومت کا مقصد صرف مخصوص جماعتی نصب العین کی پیروی اور حمایت ہے۔ حکومت نے اس اصلی اور سچی بات کو کبھی دل میں نہیں جگہ دی کہ حکومت کا مذہب صرف انصاف و رواداری اور اس کی سب سے بڑی شامت جماعتی تعصب ہے۔

اس سانحہ کا سب سے زیادہ غمناک پہلو یہ ہے کہ مسلمان مایوس اور برہم ہو کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ سوا ان کے اُردو کا کوئی اور حامی نہیں ہے۔ مجھے امید ہے مسلمانوں کا یہ خیال جلد دور ہو جائے اور ہم سب متحد ہو کر اس مایوسی اور برہمی کے ازالہ کی کوشش کریں گے

خواتین و حضرات! میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا آپ نے جس لطف و مرحمت سے میری توقیر بڑھائی ہے اس کا میں دل سے احسان مند ہوں۔ اب اتنا اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے جس صبر و سکوت سے اتنی دیر تک میرا ساتھ دیا ہے اس سے میں آپ کی اور بہت سی باتوں کا بھی قایل ہو گیا۔ (مدینہ)

(نگار) رشید احمد صاحب نے جو کچھ اس خطبہ میں فرمایا ہے وہ اپنی جگہ کتنی ہی معقول بات کیوں نہ ہو، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر معقول بات کو معقولیت کے ساتھ سنا بھی جائے، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا اثر اُس جماعت پر مطلق نہ ہوگا جس کی رعایت سے (یا اس خیال سے کہ وہ ایک ایسے پبلک ادارۂ تعلیمی سے تعلق رکھتے ہیں جس میں ہندو طلبہ بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں) انھوں نے یہ مصلحانہ و روادارانہ خطبہ ارشاد فرمایا ہے، اور دوسری جماعت نے اگر ان نصائح سے کچھ اثر لیا بھی تو وہ "اقدام خودکشی" کے انداز کا ہوگا یعنی وہ "ہندوستانی" سے سنسکرت الفاظ تو علحدہ نہ کرا سکیں گے، لیکن اُردو کو عربی و فارسی الفاظ سے ضرور بیگانہ بنا دیں گے یعنی رفتہ رفتہ "ہندوستانی" کے لئے تو سنسکرت کی تعلیم ضروری قرار پا جائے گی لیکن اُردو لکھنے والے "رشید احمد صدیقی" کو "رسید آمد سدیکی" ہی لکھنے لگیں گے۔

آپ ہندوؤں کو لاکھ سمجھائیے کہ ہندی، ہندوستانی اور اُردو ایک ہی زبان کے مختلف نام ہیں، لیکن وہ کبھی نہ سمجھیں گے۔ بلکہ سمجھنا ہی نہیں چاہتے — کیونکہ رشید صاحب کی طرح بہت سے مسلمان بربنائے مصلحت یا بزدلی یہی کہتے رہیں گے کہ اس مسئلہ کو سیاسی اہمیت دینا غلطی ہے اور ہندو اسی غلطی کا بار بار ارتکاب کر کے اسے ایسی حقیقت میں تبدیل کر دیں گے کہ جب آیندہ آزاد ہندوستان کا نیا دستور مرتب کیا جائے گا تو اس میں گائے ذبح کرنے والے اور ہندوستانی میں عربی فارسی کے الفاظ استعمال کرنے والوں کی ایک ہی سزا مقرر کی جائے گی یا اگر ان میں کچھ فرق ہوا بھی تو صرف "قصاص" و "حبس دوام" کا سا فرق ہوگا۔

رشید صاحب، "ہندو مسلمانوں" کے گزشتہ "اچھے تعلقات" کا حوالہ دیکر جس رواداری کی بھیک ہندوؤں سے مانگ رہے ہیں، اس کی حیثیت ہندوؤں کے نزدیک ایک ایسے زخم کی سی ہے جو اچھا ہو چکا ہے اور جس کو وہ دوبارہ ہرا کرنا نہیں چاہتے

پاکستان و نا پاکستان کی تفریق بجائے خود اچھی ہو یا بُری، قابل عمل ہو یا ناقابل عمل، لیکن اُردو کو اپنا استھان ضرور علیحدہ بنانا پڑیگا ہندو اپنی جگہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ وہ اپنی قدیم آریہ تہذیب کو یہاں ضرور رائج کریں گے اور "شدر" یا "ملکش" قوموں کی کسی یادگار کا ہلکے سے ہلکا نشان اپنی تہذیب و معاشرت میں باقی نہ رہنے دیں گے۔ پھر اگر یہ تحریک واقعی کوئی غیر سیاسی تحریک ہو، تو رشید صاحب کا یہ فرمانا کہ زبان کے مسئلہ کو سیاسی نقطۂ نظر سے نہ دیکھنا چاہئے، بالکل درست ہے، لیکن اگر یہ تحریک سیاسی حیثیت رکھتی ہے تو پھر رشید صاحب کا فیصلہ کیا ہوگا؟ اس کا حال ہم کو ابھی نہیں، چند سال گزر جانے کے بعد اس وقت معلوم ہوگا جب "اُردو کانفرنسوں" کے انعقاد اور رشید صاحب کو خطبۂ صدارت دینے کے لئے دفعہ ۱۴۴ کی منازل سے گزرنا پڑے گا۔

مسلمانوں نے ہندوؤں سے ملنے کے بعد جن رواداریوں سے کام لیا اس کی تصدیق ہماری معاشرت و تہذیب کے اُن بہت سے رسوم سے ہو سکتی ہے جو یکسر غیر اسلامی ہیں۔ ہم "السلام علیکم" کہنے کے عادی تھے، لیکن ہم نے ہندوؤں کی خاطر سے اسے ترک کر کے "تسلیم"، "آداب عرض" اختیار کیا لیکن اب وہ اس پر بھی راضی نہیں۔ ہم سے "پالاگن"، "جے رام جی" کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور اگر مسلمانوں نے زبان کے مسئلہ کو کوئی سیاسی اہمیت نہ دی جیسا کہ رشید صاحب نے مشورہ دیا ہے تو وہ وقت دور نہیں جب انھیں بھی اپنے کلاس میں طلبہ کے سلام کا جواب دونوں ہاتھ جوڑ کر "نمسکار" ہی سے دینا پڑے گا۔ حیرت ہے کہ اِدھر رشید صاحب، زبان کے مسئلہ کو بالکل غیر سیاسی چیز سمجھتے ہیں اور اُدھر یوروپ میں ملکوں کی سیاسی تقسیم ہی زبان کے لحاظ سے کی جا رہی ہے۔

رشید صاحب نے ہندوؤں کو مایل کرنے کے لئے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہندوؤں نے اس وقت تک اُردو کی بڑی خدمتیں انجام دی ہیں اور ان کی جماعت نے بڑے بڑے مستند ادیب و شاعر اُردو کے پیدا کئے ہیں۔ لیکن چاپلوسی کا یہ حربہ قبل بھی بارہا استعمال ہو چکا ہے اور اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اگر ہندوؤں نے اس استدلال کی تردید میں یہ کہہ دیا کہ ایسے ہندو سخت احمق تھے اور "ہندو جاتی" انھیں غدار سمجھتی ہے، تو رشید صاحب کے پاس سوائے "مسکرا دینے" کے اور کیا جواب ہو سکتا ہے (کیونکہ اس مسئلہ میں ان کو غصہ کبھی آنے کا نہیں)

اُس طرف تو جوش کا یہ عالم کہ ذمہ دار افسرانِ حکومت بھی علی الاعلان اُردو کی مخالفت کرنا اپنا فرض قرار دیں اور اِدھر یہ "احتیاط چارہ سازی" کہ اگر اس مسئلہ کو ذرا بھی سیاسی اہمیت دی گئی تو پھر — "تو دانی خرقۂ پشمینہ داری!"

یہ وقت ان دلایل کا نہیں ہے کہ اُردو ہندی ہی سے نکلی ہے اور اُردو یا ہندی فی الحقیقت ایک ہی چیز ہیں، نہ اب ان ترکیبوں سے کام نکل سکتا ہے کہ ہندوؤں کی "اُردو خدمات" کا ذکر کر کر کے انھیں رام کیا جائے، اور نہ یہ بات کوئی وزن رکھتی ہے کہ "ہندی عوام سے منوائی نہیں جا سکتی"۔ اگر اُردو "ہندی" سے نکلی ہے تو اب اسے "ہندی" ہی کا ساتھ دینا چاہئے اگر اُردو یا ہندوستانی ایک ہی چیزیں ہیں تو پھر کیوں "ہندوستانی" کے خلاف احتجاج کیا جائے — رہا ہندی کا عوام سے منوا لینا، سو یہ بھی چنداں مشکل نہیں۔ اگر ترکی حکومت دفعتاً رسم خط بدل سکتی تھی، تو ہندو حکومت (جو ہندوؤں کا واقعی

نصب العین ہے) سنسکرت ہندوستانی آمیز عوام پر نازل بھی کر سکتی ہے اور زبردستی ان سے منوا بھی سکتی ہے۔

ہندی رسم خط نے رفتہ رفتہ جتنی وسعت اختیار کرلی ہے اور اُردو رسم خط کے ساتھ حکومت کے دفاتر میں جو سلوک روا رکھا جاتا ہے، اس کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ بمبئی کے ایک صاحب اُردو میں پتہ لکھکر خط ڈاک میں ڈالتے ہیں اور ڈاک کا محکمہ بجائے مکتوب الیہ تک پہونچانے کے اسے "ڈیڈ لیٹر آفس" بھیجدیتا ہے کیونکہ اُردو رسم خط، بمبئی کا رسم خط نہیں ہے۔ پھر اگر اُردو بمبئی کا رسم خط نہیں، تو بنگال کا بھی نہیں ہو سکتا، مدراس کا بھی نہیں ہو سکتا، یو۔پی کا بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ گجراتی، مرہٹی، بنگالی، تلگو اور ہندی، رسمِ خط کے لحاظ سے تقریباً ایک ہی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور اُردو رسم خط ان میں سے کسی کے ساتھ یہ رشتہ نہیں جوڑ سکتا۔

پھر یہ بالکل نفسیاتی مسئلہ ہے کہ جب آپ کسی زبان کے رسم خط کو استعمال کریں گے تو اس کے الفاظ بھی آہستہ آہستہ آپ قبول کرتے جائیں گے اور اگر آج ہندو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ عوام میں سنسکرت آمیز ہندی رواج دیکر چھوڑیں گے تو ہمیں اس کو ماننا پڑے گا کیونکہ ہندی رسم خط خود آہستہ آہستہ سنسکرت الفاظ قبول کرتا جائے گا اور عربی فارسی الفاظ (جنھیں غیر ملکی سمجھا جاتا ہے) بالکل نکل جائیں گے۔

میں ابتدا ہی سے کہہ رہا ہوں کہ زبان سے زیادہ اہم مسئلہ رسم خط کا ہے، لیکن اس کو مسلمانوں نے ہمیشہ ثانوی حیثیت دی اور صرف سنسکرت و عربی کی لفظی بحث میں پڑے رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندی رسم خط بڑھتا رہا، ہندی کتابیں بڑھتی رہیں، ہندی اخبارات بڑھتے رہے، سرکاری دفتروں میں ہندی فارم بڑھتے رہے، الغرض

"حُسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے"

رشید صاحب نے اپنے خطبہ کے آخری جزو میں کچھ باتیں کام کی بھی بتائی ہیں اور چند اُصول و عقاید متعین کئے ہیں۔ پہلا اُصول انھوں نے یہ بتایا ہے کہ مادری زبان میں صحت و سہولت سے گفتگو کی جائے۔ بالکل درست۔ لیکن سوال یہ ہے کہ "صحت و سہولت" دونوں کا اجتماع کیونکر ممکن ہے۔ "ضیغم حسین" بنارس کے مشہور شہنائی نواز ہیں لیکن بیرس کالج کا ہندو پرنسپل ان کا تعارف "زخم حسین" کے نام سے کراتا ہے۔ اب بتائیے کہ آپ کی صحت اور ہندو کی سہولت یہ دونوں کیونکر مجتمع ہو سکتی ہیں۔ رہا گھروں کے اندر یا باہر روز کی گفتگو، سو اس میں ہم اور ایک تعلیم یافتہ ہندو دونوں ایک ہی زبان استعمال کرتے ہیں۔ نہ کوئی مولانا گھر کے اندر جاکر اپنی بیوی سے فرمایش کرتے ہیں کہ "طعام لاؤ" اور نہ جہاشے جی یہ کہتے ہیں کہ "بھوجن پروس دیو"۔ جھگڑا تو لکھنے پڑھنے کی زبان کا ہے اور یہیں آکر یہ دقت محسوس ہوتی ہے کہ کسی گہرے خیال، کسی نازک بات، یا علمی اصطلاح کو کیونکر کھانے پینے کی زبان میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اظہار کے لئے آپ کو عام زبان کے الفاظ سے ہٹکر دوسرے الفاظ استعمال کرنے پڑیں گے اور یہ "دوسرے الفاظ" ہندوؤں کے نزدیک سوائے سنسکرت کے اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ پھر گر آپ عربی فارسی کے الفاظ ترک کر بھی دیں تو کیا ہندو سنسکرت الفاظ کا

استعمال ترک کردیں گے؟

دوسرا اصول انھوں نے یہ بتایا ہے کہ "اُردو یا اسلام کو چھوئی موئی مت سمجھئے"۔ اس سے مراد ان کی غالبًا یہ ہے کہ اُردو زبان کے خطرہ کو قومی خطرہ نہ سمجھنا چاہئے۔ حالانکہ صحیح معنے میں خطرہ یہی ہے جو ہماری قومی خصوصیات پر اثر ڈال رہا ہے۔ رشید صاحب اُردو نصاب کی مروجہ کتابیں اُٹھا کر دیکھیں اور خود فیصلہ کریں کہ ان کے الفاظ، ان کے محاورات اور اُن کے اسلوب بیان سے ہماری قومی ذہنیت پر کیا اثر پڑ رہا ہے اور اس کے بعد کوئی رائے دیں۔

تیسری ہدایت انھوں نے یہ کی ہے کہ اُردو کی حمایت میں مذہبی یا سیاسی جذبات سے مغلوب نہ ہوں۔ مذہب کا تعلق تو بیشک اس مسئلہ سے نہ ہونا چاہئے (اگر مذہبیت کو قومیت سے علحدہ کردیا جائے) لیکن اس کو سیاسی اہمیت نہ دینا اتنی غلط تشخیص ہے کہ ہم اس پر بھروسہ کرکے کبھی مرض کے ازالہ میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔

چوتھی بات انھوں نے یہ بتائی ہے کہ "سہل و بامعنی اُردو لکھنے کی کوشش کیجئے، ادبی بازیگری یا مشاطگی کی اب نہ فرصت ہے نہ مانگ ——— اُردو ایسی سچی، اچھی اور متنوع زبان ہے کہ آپ سیدھی سادی عبارت میں بھی زور اور بانکپن پیدا کرسکتے ہیں۔ میں آپ سے تجربہ کی بات کہتا ہوں، تمرد یا تمسخر کی نہیں" ——— لیکن حیرت ہے کہ خود رشید صاحب بھی اس ایک فقرہ کو سہل نہ لکھ سکے ——— "بازیگری"۔ "مشاطگی"۔ تنوع ——— تمرد ——— تمسخر ——— پانچ لفظ تو اسی ایک فقرہ میں ایسے ہیں جن کو کوئی ہندو نہیں سُن سکتا اور جن کی جگہ رشید صاحب کوئی دوسرا لفظ اس لئے استعمال نہیں کرسکے کہ یہ ان کی قومی زبان کے سادہ الفاظ ہیں اور ہندو ان کا مفہوم سمجھنے کے باوجود صرف اسی لئے ان سے نفرت کرتے ہیں کہ یہ غیر ملکی زبان کے الفاظ ہیں۔ یہ حال تو صرف ایک فقرہ کا تھا، ورنہ رشید صاحب کے سارے خطبہ میں سیکڑوں الفاظ عربی و فارسی کے ایسے نظر آتے ہیں، جن کی جگہ وہ دوسرے الفاظ استعمال کرسکتے تھے، لیکن اپنی "ادبی مشاطگی" قایم رکھنے کے لئے اُن کے استعمال پر مجبور ہوگئے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ترقی یافتہ "لٹریچر" سے ادبی محاسن اور خیال و بیان کی نزاکتوں کو کیونکر جدا کیا جاسکتا ہے اور یہ کلیہ کیونکر قایم ہوسکتا ہے کہ ہم ہر خیال کو "نہر پر چل رہی ہے پن چکی" کی زبان میں ادا کرسکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ رشید صاحب کا یہ خطبہ "جذبات خلوص" کا آئینہ ہے اور انھوں نے نہایت دردمندانہ لہجہ میں وہ سب کچھ کہدیا ہے جو ایک "اُردو کے پروفیسر" کی طرف سے کہا جاسکتا تھا۔ لیکن اب یہ مسئلہ پروفیسر کی دسترس سے باہر ہوچکا ہے میں اس کو مسلمانوں کا سیاسی و قومی مسئلہ سمجھتا ہوں اور اسی حیثیت سے اس کا مطالعہ سودمند ہوسکتا ہے۔

اب نہ "اکاڈیمی" مباحث سے کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے اور نہ "انجمن ترقی اُردو" کی خالص ادبی کوششوں سے۔ البتہ اگر اس مسئلہ کو سیاسی حیثیت دیکر مسلمانوں کے سیاسی پروگرام میں شامل کرلیا جائے تو کچھ امید کی جاسکتی ہے۔ لیکن جب انکی سیاسیات کی حقیقت بھی

گستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتہ ست

ہو تو پھر اُردو کو کون پوچھتا ہے۔

اب تو ہندوستان میں اسی سنسکرت آمیز ہندی کو رواج پانا ہے اور اُردو کے متعلق کسی کا یہ فیصلہ کہ وہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور مسلمان ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں ایک ایک ہندو کے دل میں نقش ہو چکا ہے جسے ایک رشید صاحب کیا ہندوستان کے سارے مسلمان بھی ملکر محو نہیں کر سکتے۔

مجھے یہ بات سخت ناگوار ہوتی ہے، جب اس قسم کے جلسوں میں ہندؤں اور ہندوؤں کی سنسکرت آمیز بھاشا کے خلاف اظہار برہمی کیا جاتا ہے، کیونکہ ہمکو مطلق حق حاصل نہیں کہ انھیں اُردو زبان یا اُردو رسم خط کے استعمال پر مجبور کریں۔ وہ اپنی جگہ ایک فیصلہ کر چکے ہیں اور اس پر مضبوطی سے عمل کر رہے ہیں۔ پھر ہمیں کیا حق حاصل ہے کہ ان کو بُرا کہیں یا اُن کو مائل کرنے کے لئے محض ازراہ تملق اُردو سے عربی و فارسی الفاظ نکال دینے کی تحریک کریں۔

اگر مسلمان اجتماعی نقطۂ نظر سے اپنے مستقبل کے متعلق کوئی پروگرام مرتب کرنا چاہتے ہیں (جو انشاء اللہ کبھی نہ ہوگا) تو انھیں اس پروگرام میں اُردو کے مسئلہ کو شامل کرنا پڑے گا ورنہ انفرادی حیثیت سے کوئی کوشش فائدہ بخش نہیں ہو سکتی۔

رشید صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ ہندوؤں میں یہ تحریک کس حد تک قوی ہو گئی ہے اور ان کی موجودہ نسل کس محنت و کوشش سے اپنے آپ کو اُردو سے بیگانہ بنا رہی ہے۔

سر تیج بہادر سپرو ہندوؤں میں تنہا وہ شخص ہیں جو اُردو کی حمایت میں شاید بعض مسلمان سے زیادہ سختی کا اظہار کرتے ہیں، لیکن ان کی اولاد کا یہ حال ہے کہ کالج میں سب نے سنسکرت زبان لے رکھی ہے۔ اُن کے بڑے صاحبزادے کا جو ہمیں لکھنؤ میں ایک معزز عہدے پر ممتاز ہیں ایک دلچسپ واقعہ (بروایت پروفیسر فراق گورکھپوری) سنیئے:۔

ایک دن شام کو وہ کسی باغ میں صرف کرتا پہنے ہوئے چہل قدمی کر رہے تھے کہ ڈاکٹر زتشی سے ملاقات ہو گئی۔ زتشی نے پوچھا "یہ گریباں چاک کہاں؟" انھوں نے جواب دیا "چاک کا وقت تو ابھی نہیں آیا؟"۔ یہ ہے حال سر سپرو کے بڑے صاحبزادے کا۔ اور اسی پر آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ عام طور پر ہندوؤں نے اپنے آپ کو اُردو سے کس قدر بیگانہ بنا لیا ہے۔

اب اس مسئلہ میں ہندوؤں کی شکایت کرنا یا اُن کو مائل کرنے کے لئے اُردو سے عربی فارسی الفاظ نکال دینے کی کوشش کرنا بیکار ہے۔

اگر مسلمان خود اُردو کی کوئی خدمت کر سکتے ہیں تو خیر، ورنہ یہ شکوہ و شکایت اور تملق و چاپلوسی بیکار ہے۔

جذبات بھاشا

کا جدید اڈیشن۔ کاغذ و کتابت نہایت نفیس۔ قیمت ۱۲/۔ رعایتی قیمت ۹/۔ علاوہ محصول

منیجر نگار۔ لکھنؤ

باب الاستفسار

قرآن وحدیث کی زبان کا فرق

(جناب عبدالمجید صاحب حیرت بی - اے - نئی دہلی)

"قرآن کا کلام خدا ہونا کیا معنی رکھتا ہے" ـــ تازہ نگار میں دیکھا، اور وہ بھی جس سے جولائی میں اس بحث کا آغاز ہوا اس سلسلہ میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کی زبان اور ہے اور حدیث مستند کی زبان اور۔ آپ اس کی توجیہ کیونکر کرتے ہیں ؟ - ظاہر ہے کہ آیات ایک خاص کیفیت رکھتی ہیں، جسے وحی کہئے اور اقوال، دوسرے نوعیت"۔

(نگار) آپ نے جس بحث کو پیش کیا ہے وہ میرے سامنے اس وقت بھی تھی جب جولائی کا پرچہ شایع ہوا ہے اور اگست کی اُن تاریخوں میں بھی، جب ملاحظات لکھ رہا تھا۔ لیکن چونکہ قرآن مجید کو "منطوق خداوندی" تسلیم کرنے کے سلسلہ میں، شبہات واعتراضات میں خود اپنے پیش کر رہا تھا اس لئے کوئی موقعہ اس مسئلہ پر گفتگو کا نہ تھا۔

میں خوش ہوا کہ آپ نے یہ ذکر چھیڑ کر مجھے اظہار خیال کا موقعہ دیا، جس وقت میں طالب علم تھا، اسی وقت سے یہ بات میرے کانوں میں پڑی ہوئی ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں میں نمایاں ادبی فرق پایا جاتا ہے، گویا اس سے مدعا یہ ظاہر کرنا ہوکہ "قرآن" رسول کا کلام نہیں ورنہ وہ بھی "احادیث" کی طرح ہوتا۔ لیکن مینے کبھی اس کو اہمیت نہیں دی۔ کیونکہ یہ دلیل قرآن مجید کو خدا کا کلام ثابت کرنے کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن اپنی فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے بہت بلند چیز ہے اور یقیناً اس زمانہ کے عربی لٹریچر میں نثر کی اتنی بڑی کتاب ایسا آہنگ انداز خطابت رکھنے والی کوئی موجود نہ تھی، لیکن یہ دعوے کرنا کہ اس قسم کا انداز بیان عربی لٹریچر میں مفقود تھا درست نہیں۔ اُس وقت کے تمام کاہنوں اور بڑے بڑے شعراء وادباء کے کلام میں اسی قسم کا زور پایا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے اس وقت اہل عرب کی دھوم تھی اور سوق عکاظ کی ادبی صحبتوں اور قصاید معلقہ کی فصاحت وبلاغت نے لوگوں کو حیران کر رکھا تھا۔

اسی کے ساتھ آپ کو غالباً یہ بھی معلوم ہوگا کہ رسول اللہ قریش کے اس قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے جو اپنی زباندانی اور فصاحت لسانی کے لحاظ سے فرد مانا جاتا تھا اس لئے اگر آپ کی زبان غیر معمولی ادبی محاسن سے مالامال تھی تو تعجب کی بات نہیں۔ لیکن یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر "قرآن" بھی رسول ہی کا کلام ہے تو اس کی زبان کیوں احادیث کی زبان سے ممیز ہے۔ اس کا جواب زیادہ مشکل نہیں۔

آپ نے اگر نفسیات کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا تو یہ بات آپ کو معلوم ہوگی کہ الفاظ کا تعلق جذبات انسانی سے کس قدر شدید ہے۔ یعنی ہمارے جذبات کی جو نوعیت ہوگی وہ الفاظ اور انداز بیان سے ضرور مترشح ہوگی۔

ہمارا روز کا تجربہ ہے کہ ہمارے جذبات محبت و عداوت اور کیفیات مسرت و غم کی شدت و خفت کے ساتھ ساتھ ہماری زبان بھی بدلتی رہتی ہے۔ ہم اگر ملازم سے کسی معمولی غلطی پر خفا ہوتے ہیں تو اس کو صرف "بدتمیز و بیہودہ" کہکر خاموش ہو جاتے ہیں، لیکن اگر غلطی سخت ہوتی ہے تو پھر ہم اپنی برہمی کی شدت کے لحاظ سے دوسرے زیادہ سخت الفاظ تلاش کرتے ہیں، یہانتک کہ گالی دینے لگتے ہیں اور کبھی کبھی مار بھی بیٹھتے ہیں۔ یہی حال تمام اور جذبات کا ہے۔

آپ نے اگر کسی بیوہ کو اپنے مرنے والے شوہر، یا کسی بڑھیا ماں کو اپنے جوان بیٹے کی میت پر بین کرتے سنا ہے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جذبات کی شدت، زبان میں کس قیامت کا اثر پیدا کر دیتی ہے۔ اس حالت میں جو الفاظ اُس بیوہ یا ضعیف ماں کی زبان سے نکلتے ہیں، وہ تیر و نشتر ہوتے ہیں، جو قیامت تک ان کے منہ سے نہ نکلتے اگر خود ان پر یہ مصیبت نازل نہ ہوتی۔

اب آپ شاعری کی دنیا میں آئیے جس کے ایک فرد آپ بھی ہیں اور غور کیجئے کہ ہم کیوں ایک ہی شاعر کے کلام میں بعض اشعار پست اور بعض بلند پاتے ہیں۔ میر خدائے تغزل ہے، لیکن کیا اس کے تمام اشعار اسی معیار کے ہیں۔ انیس، مرثیہ کا بادشاہ ہے، لیکن صرف ذکر بزم و رثا کی حد تک، رزم میں وہ بالکل ناکام نظر آتے ہیں۔ آپ فارسی، عربی اور تمام زبان کے شاعروں کے کلام کا مطالعہ کریں گے تو پست و بلند سب طرح کے اشعار پائیں گے۔ پست وہ جو کسی خاص کیفیت کے تحت نہیں لکھے گئے اور بلند وہ جو کسی شدید جذبہ و کیفیت کا نتیجہ ہیں۔ آپ خود اپنے کلام کو دیکھئے کہ آپ کے بہترین اشعار کون کون سے ہیں اور پھر غور کیجئے کہ کیا ان کے بہتر ہونے کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ ایک خاص کیفیت کے زیر اثر لکھے نہیں گئے بلکہ از خود ہو گئے ہیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ اچھا شعر "ہو جاتا" ہے، لکھا نہیں جاتا، اور بعض ایسے اشعار جو پورے کے پورے بغیر کسی کاوش کے ذہن میں آجاتے ہیں انھیں شاعروں کی زبان میں بھی الہامی کہتے ہیں۔

اب آپ دیکھئے کہ قرآن کی ابتدا کن حالات میں ہوتی ہے۔ قبیلۂ قریش میں ایک نہایت ہی پاکیزہ خصائل و صفات کا انسان پیدا ہوتا ہے اور ہوش سنبھالتے ہی اپنی قوم کو اپنے عزیزوں کو نہایت مکروہ افعال میں مبتلا دیکھتا ہے، اس کا دل بہت کڑھتا ہے، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وہ کیا کرے، وہ رات کی تنہائیوں میں، ساری دنیا سے کٹ کر

پہاڑ کے غاروں میں چھپ چھپ کر اس مسئلہ پر غور کرتا ہے، یہاں تک کہ ایک قرن سے زیادہ اسی حال میں گزر جاتا ہے۔ اسنے اپنی زندگی کا تنہا مقصود صرف یہ قرار دے لیا ہے کہ وہ اپنی قوم کی اصلاح کرے گا، ان کی بُری عادتیں ان سے ترک کرائے گا اور جب سوچتے سوچتے اس کے جذبات میں انتہائی شدت پیدا ہو جاتی ہے، تو بے اختیار وہ اپنا پیام سنانے لگتا ہے۔

پھر اس پیام کے الفاظ یقیناً اسی شخص کے ہیں اور اسی زبان کے ہیں جو اس وقت وہاں رائج تھی، لیکن اسکا بدیع اسلوب بیان، اس کا بڑھا ہوا جوش اور اس کا اثر نتیجہ ہے، اس کیفیت کا جو اس کے دل و دماغ میں سالہا سال سے موجیں مار رہی تھیں اور بالآخر ایک چشمہ کی طرح پھوٹ نکلی۔ اسی کا نام وحی ہے، اسی کو الہام کہتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس نے قرآن کی عبارت کو احادیث کی عبارت سے تمیز کر دیا ہے۔

احادیث کا اکثر حصہ تو ایسا ہے جو یکسر موضوع ہے اور تھوڑا سا حصہ جسے موضوع نہیں کہہ سکتے اس کی حالت بھی یہ ہے کہ اس میں وہ احادیث زیادہ ہیں جو بالمعنی روایت کی گئی ہیں اور جنھیں رسول اللہ کے الفاظ من و عن نقل نہیں کئے گئے۔ صرف چند احادیث ایسی ہیں جن میں ہم "رسول اللہ" کے الفاظ کی جھلک پاتے ہیں، سو ان کی فصاحت و بلاغت کا عالم دیکھئے کیا ہے، لیکن چونکہ وہ زیادہ شدید کیفیت کا نتیجہ نہیں ہیں اس لئے آیات قرآنی کی سی خصوصیات ان میں البتہ نہیں پائی جاتیں۔ قرآن دفعتًا نازل نہیں ہوا ہے بلکہ نجمًا نجمًا نازل ہوا ہے، یعنی جب کبھی رسول اللہ پر اس کیفیت کا غلبہ ہو جاتا تھا تو چند آیات آپ کی زبان سے نکل جاتی تھیں، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ پوری ایک کتاب مرتب ہو گئی جسے اب ہم "قرآن مجید" کے اصطلاحی نام سے موسوم کرتے ہیں۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ اپنے مدعا کو پوری طرح سمجھانے میں کامیاب ہو سکا ہوں یا نہیں، لیکن مجھے امید ہے کہ آپ کی ذہانت بات کی تہ تک ضرور پہونچ جائے گی اور جو میں کہنا چاہتا ہوں اور نہیں کہہ سکا ہوں وہ بھی آپ سمجھ جائیں گے۔

آیندہ جنوری کا سالنامہ

کیا ہوگا؟

اس کے متعلق آپ صفحہ ۲ ملاحظہ فرمایئے

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

عطوفت پناہا! غالباً زندگی میں یہ بالکل پہلا واقعہ ہے کہ میں نے آپ کی کسی تحریر کا جواب اتنی تاخیر سے دیا ہو۔ مجھے زیادہ شرمندگی اس لئے ہے کہ کوئی معقول عذر بھی پیش نہیں کر سکتا

میں اس دوران میں تقریباً ایک مہینے باہر رہا اور جب واپس آیا تو جسم و دماغ دونوں اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ اب کیا عرض کروں

میں نے آپ کی تجاویز پر پورا غور کر لیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ مجھے ان کی کامیابی پر اعتماد نہیں۔ نہ اس لئے کہ آپ کی طرف سے سعی و کاوش میں کوئی کمی ہوگی بلکہ اس خیال سے کہ

گوشِ سخن شنو کجا، دیدۂ اعتبار کو؟

ہمارا عملی جمود فی الحقیقت ہمارے ذہنی جمود کا نتیجہ ہے۔ ہمارا کچھ نہ کرنا اس لئے ہے کہ ہم خود کچھ سوچ نہیں سکتے۔ "عقل و فہم" کو ہم نے "میراثِ پدر" تو سمجھا لیکن اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔

لیکن خیر، کہنے میں کیا حرج ہے، اگر کسی نے نہ سنا تو کم از کم دل کی بھڑاس ہی نکل جائے گی۔ بت بنا کر اسکی پوجا کرنے والا اس سے بے نیاز ہوتا ہے کہ دوسرے بھی اس کے سامنے جھک جائیں

میری شرکت کے متعلق یوں تو آپ کا ہر ہر لفظ فرمان کا حکم رکھتا ہے، لیکن یہ دیکھ لیجئے کہ اس مسئلہ میں میرے آپ کے درمیان کتنی دوری پائی جاتی ہے۔ علاوہ اس کے اب میرے قویٰ میں اتنی سکت بھی نہیں رہی کہ اس کو ہ کنی میں آپ کا ساتھ دے سکوں

ایک بات اور —— اگر ناگوار نہ ہو —— آپ نے سنا ہوگا

گُل کسے جوید کہ اور اگوشۂ دستار ہست

اس لئے پہلے مجھے "دستار" کی فکر سے تو بے نیاز ہو جانے دیجئے، "خار و گل" کے امتیاز کا سوال تو بعد کی بات ہے!

خدا کے لئے جلدی بتاؤ، یہ تم نے اپنے خط میں کس کا ذکر کیا ہے؟ ان کا تو نہیں جنھوں نے باوجود معشوق ہونے کے کبھی بیوفائی نہیں کی! ارے بھئی، مجھے تو ان کی بہت دنوں سے تلاش تھی۔ فوراً بھیجدو، ایک کام ہے جو صرف انھیں سے

انجام پاسکتا ہے۔ تم نے تو اس وقت مجھے خضر و مسیحا سے ملا دیا۔ ہاں تو اطلاع دو کہ وہ یہاں کب اور کس وقت پہونچیں گے؟

جراحت نوازا - مکتوب جمیل کا شکریہ، لیکن بالکل رسمی! جو بات خلوص سے نہ ہو، اس کا جواب رسمی ہی ہوا کرتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے بیک وقت دو خط لکھے، ایک اپنے "اُن" کو اور دوسرا مجھے۔ آپ کو شرمندہ کرنا نہیں چاہتا ورنہ بتا دیتا کہ آپ نے اُس میں کیا لکھا ہے۔ یہ شکایت نہیں، بلکہ آپ کے "شیوۂ کار آگہی" کا اعتراف ہے۔ کوئی ایسا ہو تو؟ اللہ، اللہ!

زورِ دگرست ایں گماں را

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور اب پھر عرض کرتا ہوں کہ جو کچھ کہنا ہو صاف صاف کہئے۔ اگر میں بیوقوف ہوں تو مجھے بیوقوف کہئے۔ عقلمند کہکر میری بیوقوفی سے فایدہ نہ اُٹھائیے۔ اس سے میرے جذبۂ ایثار کو صدمہ پہونچتا ہے اور ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ شاید میں اس قابل ہی نہیں کہ مجھ پر اعتماد کیا جائے

اگر میری طرف سے اعترافِ حماقت کا اس سے زیادہ کوئی اور ثبوت درکار ہو تو یہ عریضہ حاضر ہے۔ کہ۔ جس بات کا جواب صرف "خاموشی" ہونا چاہئے تھا، اس کے لئے خواہ مخواہ میں نے آپ کا اور اپنا اتنا وقت ضایع کیا

اگر آپ کو جلانا ہی تھا تو اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت تھی، میں کوئی "ابراہیمؑ" تو ہوں نہیں کہ میرے جلانے کے لئے پہلے "نمرود اور آتشِ نمرود" کی جستجو کی جائے۔ معمولی آدمی ہوں بغیر آگ کے بھی مجھے جلایا جا سکتا ہے!

گرامی عزیز - مکتوب محبت کا شکریہ۔ آپ نے زندگی کا جو مقصود متعین کیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے، سوائے اس کے کہ ایسی آرزو کرنے والے کامیاب بہت کم ہوتے ہیں۔ قدرت اتنی فیاض نہیں کہ وہ ایک ہاتھ سے آپ کو جامِ شراب دے، اور دوسرے ہاتھ سے سنبھالتی بھی رہے۔ جلوۂ طور کے طالب کے لئے جلنا ہی قسمت میں لکھا ہے۔ بہرحال مجھے آپ کی ان روحانی بیچینیوں کا حال معلوم کرکے اس کا یقین تو ضرور ہو گیا کہ آپ کو کچھ نہ کچھ بننا ہے۔ لیکن کیا؟۔ اسکی خبر نہیں۔ آپ اپنے افسانے یا نظمیں میرے پاس بھیجئے، میں ضرور ان سے استفادہ کروں گا۔

نوٹ کر لیجئے کہ پُرانے پرچے پر ڈاک خانہ بجائے رعایتی محصول ایک پیسہ فی پرچہ کے پانچ گنا وصول کرتا ہے اس لئے اگر دفتر میں پرچے کی عدم وصولی کی اطلاع آخر ماہ تک نہ آئی تو ہم پرچہ بیرنگ بھیجنے پر مجبور ہوں گے اور آپ کو دوبارہ وصول کرنا پڑے گا یا اگر اطلاع کے ساتھ پانچ پیسے کے ٹکٹ ہمیں موصول ہوں گے تو تعمیل ہو سکے گی۔ ورنہ نہیں۔ اور اس کے لئے دفتر مجبور ہوگا۔

منیجر نگار

"قرآن" نام اسکے مفہوم کا ہے نہ کہ الفاظ کا

الصلح خیر

ہر جدت کو بدعت اور ہر اختلاف کو الحاد سمجھنے والے اصحاب کو اختیار ہے کہ علامہ نیاز کو ابو جہل اور ابولہب کا خطاب عنایت فرما کر اصل مبحث سے چشم پوشی فرمالیں لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ ان کی چشم پوشی مجرمانہ سکوت کے مترادف سمجھی جائے گی۔ آج نہ شوکتِ بغداد باقی ہے نہ فرِ غرناطہ کہ منکرینِ حدوثِ قرآن کے سر بیک جنبشِ قلم قلم کر دیے جائیں اور نہ قرونِ اولیٰ کے وہ سیدھے سادھے مسلمان موجود ہیں جن کی نظر میں "من قال" کی وقعت اتنی زیادہ ہو کہ وہ "ما قال" کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں، پھر کیا یہ امر مناسب نہ ہوگا کہ لوگوں کو ابو جہل اور ابولہب بنانے کے بجائے انکے اعتراض کا معقول جواب دیا جائے اگر علامہ نیاز کے اعتراضات کسی کفر انگیز ندرت کے حامل ہوتے تو ان پر فتنۂ و فساد برپا کرنے کا الزام عاید کیا جا سکتا تھا لیکن جب قرآن مجید کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کا مسئلہ دوسری صدی ہجری سے چھڑا ہوا ہے جب معتزلہ سر سید احمد خاں اور خواجہ احمد الدین صراحتہً نزول جبریل سے انکار کر چکے ہیں، جب ناز پروردۂ حرم مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن میں حیاتِ اصحابِ کہف اور دوسرے اسلامی مسلمات سے انکار فرما چکے ہیں اور جب خود حضرت عائشہ اور حضرت معاویہ کا شمار منکرینِ معراجِ جسمانی میں ہے تو علامہ نیاز سے یہ شکایت کیوں کی جائے کہ انھوں نے شاہراہ عام سے علحدہ ہو کر ایک نیا راستہ اختیار کیا ہے؟

پھر یہ بات بھی کچھ کم تحیر خیز نہیں ہے کہ منکرینِ وحی سے قطع نظر فرما کر "نظر التفات" اس شخص پر مبذول کی جائے جو علی الاعلان کہہ رہا ہے کہ خدا نے علی وجہ البصیرت تمام احکام رسول اللہ پر نازل کیے جنھیں آپ نے اپنی زبان میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا (نگار - اگست ۱۹۴۰ء صفحہ ۷)

قرآن مجید کو نظر تعمق سے دیکھا جائے تو جہاں بواسطہ حضرت جبریل نزولِ وحی ثابت ہوتا ہے وہاں بلا واسطہ بھی نزولِ وحی کا اثبات ہوتا ہے مثلاً "علمہ شدید القویٰ" یا "فاوحیٰ الیٰ عبدہ ما اوحیٰ"، اور خود علمائے عظام نے بھی وحی کی اس نوع کو تسلیم کیا ہے چنانچہ حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے "ومنہ ما قذفہ فی قلوبہم" یعنی وحی میں

وہ شے بھی شامل ہے جس کو وہ انبیاء علیہم السلام کے قلوبِ مبارک میں ڈال دیتا ہے۔ رہا نزول حضرت جبریلؑ تو کسی صحیح حدیث سے یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتی کہ رسول کریم صلعم کے علاوہ کسی اور شخص نے ان کو وحی لاتے دیکھا یا قرآن پڑھتے سُنا گویا امت کے لئے قلبِ مبارک پر نزول روح الامین انزل بہ الروح الامین علےٰ قلبک۔ (الشعرا) اور روح الامین کا متشکل ہو کر آنا مساوی ہے اس لئے اگر کوئی شخص حضرت جبریلؑ کی شخصیت کا تعین کئے بغیر نزولِ وحی کو کسی اشارۂ فطری یا فوق العادت قوت کا نتیجہ سمجھے تو بھی اسے منکرین وحی میں محسوب نہ کریں گے۔ علماء کرام کی بعض متضاد باتوں کی طرح علامہ نیاز کا یہ رویہ بھی میری عقل و فہم سے بالاتر ہے کہ رسول مقبول کی تصدیقِ کلی کے بعد جزئی امور میں آنحضرت سے خواہ مخواہ اختلاف کیا جائے۔

بے شک قرآن حکیم میں حضرت جبریلؑ کے ہزاروں پروں کا ذکر نہیں ہے لاریب قرآن مجید میں ان کا بصورت "وحیۂ کلبی" رسول اللہ کے پاس آنا مذکور نہیں ہے لیکن نزول جنابِ جبریلؑ ثابت ہے اس لئے یہ تو کہا جاسکتا ہو کہ جبریلؑ ایک ایسے فرشتے یا ایسی قوت کا نام ہے جس کی صورت و ماہیت سے ہم ناواقف ہیں لیکن یہ کہنا کہ جبریلؑ کا کوئی وجود نہیں رسول اکرم کو نقل کفر کفر نباشد اللہ تعالےٰ پر افترا باندھنے والا کہنا ہے۔

قرآن مجید کے حدوث و قدم کی بحث کو بعض متکلمین نے حسن و خوبی سے طے کرنا چاہا ہے وہ کہتے ہیں کہ مقروّ (یعنی مضمون و معانی) قدیم ہے اور قرارت (یعنی الفاظِ قرآن) حادث۔

رہا یہ خدشہ کہ حق تعالےٰ غیر مجسم ہے پھر اس نے حضرتِ جبریلؑ کے سامنے قرأت قرآن کیونکر فرمائی تو کسی صحیح حدیث سے حق تعالےٰ کی قرأت قرآن ثابت نہیں ہوتی۔ مندرجۂ ذیل حدیث قابلِ غور ہے۔

"قال رسول اللہ من این تاخذ الوحی فقال اٰخذہ من اسرافیل فقال و من این یاخذہ قال من ملک فوقہ من الروحانیین قال فمن این یاخذہ ذلک الملک قال یقذف فی قلبہ قذفا۔

رسول اکرم صلعم نے جبریلؑ سے دریافت فرمایا کہ تم وحی کو کہاں سے حاصل کرتے ہو عرض کیا کہ اسرافیلؑ سے فرمایا کہ اور اسرافیلؑ کہا کہ ایک روحانی فرشتے سے جو ان سے بلند تر ہے فرمایا اور وہ فرشتہ عرض کیا کہ اسکے دل میں القا ہوتا ہے۔

اسی روایت سے ملتی جلتی وہ روایات ہیں جن میں اس امر کی تصریح ہے کہ جناب جبریلؑ نے لوحِ محفوظ میں وحی دیکھی یا خود ان کے قلب مبارک پر القا ہوا۔ اب اگر کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ فرشتوں کی وساطت کی کیا ضرورت تھی خود رسول مقبول کے قلب مبارک پر القا کیوں نہ ہوا تو پہلے جناب معترض اس بات کا جواب دیں کہ خداوند عالم نے ارض و سما و ما بینہما کو چھ دن یا چھ دور میں کیوں خلق فرمایا خلقتِ انسانی میں ماں باپ کی وساطت کیوں ضروری تصور فرمائی تناسل کا یہ قانون بعض حشرات الارض کے لئے (جو ایک جسم کے دو جسم ہو جاتے ہیں) کیوں توڑ دیا وغیر ذلک؟

خمستانِ مغرب کے بادہ نوشوں کی طرح قرآن مجید سے یکسر انکار کو نادر بات ہے لیکن قرآن حکیم کے بعض حصص کو (یعنی احکام) الہامی اور بعض حصص (یعنی قصص) کو غیر الہامی ماننا۔ ع: "منکرے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن" کا مترادف ہے، کیا خوب ہو اگر حضرت علامہ نیاز اس دو رنگی کو چھوڑ کر یک رنگی اختیار فرمالیں

طالب صفوی

(نگار) جناب طالب صفوی نے ہر چند کھلے الفاظ میں اپنے ذاتی عقیدہ کا اعلان نہیں کیا لیکن ان کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بعض متکلمین کی طرح قرآن کے مضمون و معانی کو اصل قرآن قرار دیتے ہیں اور الفاظ کو وہ حادث سمجھکر رسول اللہ سے منسوب کرتے ہیں۔ بالکل یہی خیال میرا بھی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے علماء کرام بھی یہی کہتے ہیں، کیا "وحیۂ کلبی" والی حدیث کو وہ صحیح باور نہیں کرتے اور کیا وہ صاف صاف یہ کہنے کے لئے طیار ہیں کہ قرآن پاک کے الفاظ خدا کے الفاظ نہیں بلکہ رسول اللہ کے الفاظ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے اکثر دل میں یہی سمجھتے ہوں لیکن زبان سے کہنے کی جرأت ان میں سے شاید چند کو بھی نہ ہوگی۔

وہ مجھے ابوجہل کہیں یا ابولہب (درانحالیکہ میں نے کبھی رسول کی رسالت میں شک نہیں کیا) لیکن ان کا یہ سب و شتم مجھ سے میرا یہ ذہنی حق کبھی نہیں چھین سکتا کہ جو کچھ میں سمجھوں غور کرکے سمجھوں اور اسلام کے قدرتی چشمۂ فیضان سے بغیر خس و خاشاک دور کئے ہوئے سیراب ہونے کی کوشش نہ کروں۔

دنیا میں جبر و سختی سے ایک شخص کی زبان کو بند کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے ذہن و دماغ پر مُہر نہیں لگائی جاسکتی، اسکے قلب کو مطمئن نہیں کیا جاسکتا اور اگر اسلام یا کسی مذہب کا تعلق اطمینان نفس و ضمیر سے ہے، تو ہمارے علماء کرام کی یہ "کافر سازیاں" دنیا میں "ابوجہل و ابولہب" کی آبادی بڑھانے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتیں۔

میں نے جبرئیل یا دوسرے ملائکہ کے وجود سے کبھی انکار نہیں کیا، لیکن ان کے وجود کی نوعیت کو مادیت سے بلند و برتر ضرور سمجھتا ہوں، میں جبرئیل کو بھی قدرت کی بیشمار قوتوں میں سے ایک قوت (Instinct) سمجھتا ہوں، جس کا تعلق روحانی برتری سے ہے اور ظاہر ہے کہ وہ اشارۂ غیبی، جو وحی کا دوسرا نام ہے، اور جس کی مدد سے رسول اللہ نے لوگوں کو ہدایت فرمائی کسی ایسی ہی روحانی قوت کی تحریک کا نتیجہ ہونا چاہئے تھا۔

رہا قصص قرآنی کا مسئلہ، سو میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ ان کا تعلق وحی و الہام سے نہیں ہے لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ ان کو تاریخی اہمیت نہ دینا چاہئے، بلکہ ان کی اس روایتی اہمیت کو پیش نظر رکھنا چاہئے جس کا تعلق درس اعتبار و بصیرت سے ہے۔ میرا یہ کہنا صرف اس لئے ہے کہ اگر جدید تحقیقات کی بنا پر یہ تمام واقعات ناقابل اعتبار قرار پا جائیں، تو بھی قرآن کی

صداقت کو کوئی صدمہ نہ پہونچے اور علمی حقایق کی دنیا میں اسکی اہمیت بدستور باقی رہے، اس سلسلہ میں مجھ پر ایک سطحی دماغ کا انسان یہ اعتراض کرسکتا ہے کہ میں علم انسانی کو علم ربانی پر ترجیح دیتا ہوں، لیکن اس کا یہ اعتراض صحیح نہ ہوگا کیونکہ دُنیا میں ہر علم خواہ وہ کسی ملک وقوم سے تعلق رکھتا ہو، یکسر ربانی چیز ہے اور نتیجہ ہے اس ذہنی قوت کا جو قدرت نے انسان کے اندر ودیعت کردی ہے۔

خدا نے آنکھ بنائی ہے تو اس کی بصارت بھی خدا ہی کی پیدا کی ہوئی چیز ہے اگر ذہن و دماغ عطا کیا ہے تو اس کی بصیرت بھی عطیۂ خداوندی کہلائے گی عقل کا دروازہ نہ کبھی بند ہوا ہے نہ ہوگا اور جب تک ہم اس کے اندر سے ہوکر نہ گذریں "مدینۃ العلم" میں داخل نہیں ہوسکتے۔

آپ کے فایدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علحدہ علحدہ خرید فرمائیں تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ برین:-

نگارستان	دو روپیہ
جمالستان	چار روپیہ
ترغیبات جنسی	تین روپیہ
شہاب کی سرگزشت	ایک روپیہ
استفسار و جواب سہ جلد	نو روپیہ
معرکۂ سخن	ڈھائی روپیہ
مکتوبات نیاز	ڈھائی روپیہ
اُردو شاعری	دو روپیہ
ہندی شاعری	ڈیڑھ روپیہ
میزان کل	ستائیس روپیہ آٹھ آنہ

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپے میں ملجائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

جنگ پر جانے والے جہاز میں

میں کھڑا تھا، میرا بایاں بازو چار انچ کی دہانہ والی توپ کی نال پر تھا۔ چودھویں رات کی چاندنی پانی سے کھیل رہی تھی۔ ہنس رہی تھی کہ دفعتاً اس کی چمک میری آنکھوں میں سماگئی اور یکایک میرے پپوٹے بند ہونے لگے۔

آدھی رات، سکوت کا عالم، ہر طرف نیند ہی نیند، سمندر کا تلاطم، تند ہوائیں، ڈیوٹی پر ملاحوں کی خاموشی، چلنے والے انجنوں کا شور، جہاز جا رہا تھا، جا رہا تھا، جا رہا تھا۔

"میں دیکھ رہا ہوں، ایک کسان سفر کر رہا ہے، تھکا ماندا، چور چور، وہ ٹیکسی اور ٹرین سے کیوں بے نیاز ہے؟ مجبور ہے میں نے اپنی آنکھیں اُس کی راہ میں بچھا دی ہیں، اُسے بہت دور جانا ہے، اور ضرور جانا ہے، لڑکے کے بچنے کی امید نہیں۔۔ گاؤں میں کوئی حکیم نہیں، مہاجن سے بیس روپے قرض لیکر شہر سے دوا لایا ہے۔ لڑکا بچ جائے گا، تو قرض بھی اُتر جائے گا۔ اب نہیں چلا جاتا، پاؤں درد کرتے ہیں، بیٹھ گیا، چاندنی میں پاؤں کے چھالے آنسوؤں کی طرح چمک رہے ہیں۔ ایک کار آرہی ہے، ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کوئی کروڑپتی کہیں جا رہا ہے، معلوم نہیں کون اونگھ رہا تھا، ڈرائیور یا مسافر؟ یکایک کار اُس کو روندکر نکل گئی۔

میں دیکھ رہا ہوں، ایک عورت اپنے بیمار بچے کی چارپائی کے پاس بیٹھی ہے، میلی، کچیلی، گندی چارپائی، میلے کچیلے، کثیف کپڑے، غمخوار ہمسائے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، اکیلی رہ گئی، بچے کی حالت بگڑتی جا رہی ہے، دوا کا انتظار ہے، قیامت کا انتظار ہے۔ کھانسی ایک بار، دو بار، تین بار، بچہ ختم، ماں نے کہرام مچا دیا، کسی نے دروازہ پر دستک دی، کیا باپ دوا لے کر آگیا؟ کیا حاصل؟ کسی نے اندر آکر بتایا، بچے کا باپ موٹر کے نیچے آکر مر گیا، عورت پاگل ہوگئی، گاؤں جمع ہوگیا۔ دفن کی تیاری ہو رہی ہے۔

میں دیکھ رہا ہوں، کار ایک خوبصورت بلڈنگ کے سامنے کھڑی ہوگئی، ایک خوبصورت عورت کی خوبصورت بلڈنگ، وہ بازار میں اپنے حُسن کی نمائش سے تنگ آگئی ہے، چھت پر ، اپنے تاریک مستقبل کو چاندنی میں دیکھ رہی ہے۔ ایسی ہی ایک چاندنی رات میں کسی بے وفا نے اُس کے دل پر پہلا زخم کیا تھا۔ اُسے یاد ہے، اب وہ کہاں ہے۔ اُسے معلوم نہیں غیرت سے اپنے دل پر ہزاروں زخم کر ڈالے، —— اب وہ سب کی ہے اور کسی کی نہیں، سوسائٹی کا داغ اُس سے نفرت؟

ہے سوسائٹی کا دل اُس کے پاؤں چومتا ہے، سوسائٹی کی لڑکیاں اُس سے مرد کو مایل کرنا سیکھتی ہیں۔ سوسائٹی کے لڑکے اُس سے اپنے پاؤں پر کھڑا۔۔۔ ہونا سیکھتے ہیں۔ وہ اُداس ہے، شاید انتقام کی بے رحمی پریشان کر رہی ہے، شاید دوزخ کی آگ ستاتی ہو یا گل ہے، انسان کی مجبوریاں دوزخ کے انگارے ہیں، انسان کی مجبوریاں مٹ جاتی ہیں، دوزخ کے انگارے بجھ جاتے ہیں۔ اُس کا دوزخ چاندنی کی طرح ٹھنڈا ہے، نہیں ایک آہنی ارادہ رکھنے والی عورت دوزخ سے نہیں ڈرتی، غلامی کی زندگی کو ٹھکرا کر خودداری کی زندگی بسر کرنے والی عورت اپنے انصاف کے لئے کسی دوسری عدالت میں نہیں جاتی، وہ اپنے افعال پر واجب یا غیر واجب کا حکم خود لگانا جانتی ہے۔ ہوسکتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے نفسیاتی پہلو پر غور کر رہی ہو۔ وقت اُس کی آنکھوں کے جادو کو کمزور کر ڈالے گا، تو کیا وہ زندگی کے جہاد میں تنہا ثابت قدم رہ سکے گی؟ آہ تنہائی! کسی نے چونکا دیا، "وہ آپ کو بلا رہے ہیں"۔ "کون؟" "وہی" "اُن سے کہہ دو میں اچھی نہیں" "لیکن" "اچھا! چلو میں آتی ہوں" اُس کو مصنوعی مسکراہٹ میں حقیقی دلکشی پیدا کرنا آتا ہے، کسی کو کیا معلوم اُس کی مسکراہٹ کی ہر موج میں آنسوؤں کے کتنے طوفان پنہاں ہیں۔

میں دیکھ رہا ہوں، ایک عورت اور ایک آدمی باتیں کر رہے ہیں، میں جانتی ہوں، وہ کہاں جاتے ہیں، میں جانتی ہوں وہ میری پروا نہیں کرتے، میں جانتی ہوں، وہ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹا رہے ہیں، اور ایک وفا شعار بیوی کی حیثیت سے میں اُن کو ان حرکتوں سے باز رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر چکی ہوں، وہ نہیں سنتے میں مایوس ہو چکی ہوں۔ میں عورت ہوں، دل رکھتی ہوں، جذبات رکھتی ہوں، وہ اپنی زندگی میں دلچسپی چاہتے ہیں، میں بھی چاہتی ہوں، وہ خانگی ذمہ داریوں سے بھاگتے ہیں، میں بھی بھاگتی ہوں۔ میں غیر ضروری قربانی کی قایل نہیں ہوں، میں اُس بازاری حسینہ سے اپنے خاوند کی بھیک مانگنا نہیں چاہتی، اُن کے دل میں میرے لئے جگہ نہیں، میں کسی اور کے دل میں اپنے لئے جگہ بنا سکتی ہوں سوسائٹی نے ایسی عورتیں پیدا کر دی ہیں۔ جن کے ساتھ ہر آدمی کو خلوت کی اجازت ہے۔ سوسائٹی کو ایسے آدمی بھی پیدا کرنے چاہئیں، جن کے ساتھ ہر عورت کو خلوت کی اجازت ہو، ایسا نہیں، آدمی عورت کو اپنا غلام سمجھتا ہے، ایک کھلونا جذبات سے عاری، احساسات سے محروم، جب دیکھا، توڑ ڈالا، جب چاہا دور پھینک دیا، میرا خیال حیرت انگیز ہے، عورت مساوی حقوق مانگتی ہے۔ میرا مطالبہ انتہائی مشکل رکھتا ہے، آدمی کو اُس کی زیادتیوں کا احساس دینے کے لئے یہ آخری حربہ ہے۔ اب تم سے چھپ چھپ کر نہیں ملوں گی، مجھ کو بھی اپنے دوستوں سے ملنے کا حق ہے۔ کیا تمہارے دل میں میرے لئے کوئی احساس ہے؟ "میں تم سے محبت کرتا ہوں" پیاری، بیخودی کے عالم میں اُن کے ہونٹ ایک دوسرے سے مل گئے۔

میں دیکھ رہا ہوں، مردہ خانے میں ایک لاش پڑی ہے، کل اُس کا پوسٹ مارٹم ہوگا، اس غریب کسان کی لاش نے ڈاکٹر کو دس ہزار روپے کا فایدہ پہنچایا ہے۔ وہ لکھ دے گا کہ اُس کی موت موٹر سے نہیں ہوئی۔ ایک کروڑ پتی کو سوسائٹی سزا دینے سے ڈرتی ہے۔ روپیہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ کیا مظلوم کی دادرسی نہ ہوگی؟ کیا ظالم کو سزا نہ ملے گی؟ کیا ان دو سوالوں کا جواب ممکن ہے؟ مظلوم، مظلوم پیدا ہوتا ہے، مظلوم جیتا ہے، مظلوم، مظلوم مرتا ہے، ظالم، ظالم پیدا ہوتا ہے

ظالم ظالم جیتا ہے۔ ظالم ظالم مرجاتا ہے مظلوم کی فریاد نہیں سنی جاتی، ظالم کا انصاف نہیں ہوتا، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کیا دوزخ اور جنت ایک حقیقت ہے؟ کیا قیامت کا دن عدالت کا دن ہوگا؟ کیا ان دو سوالوں کا جواب ممکن ہے؟ انسان کی دماغی آفرینش غلط بھی ہو سکتی ہے، مظلوم کے لئے جنت کا اطمینان، ظالم کے لئے دوزخ کی آگ۔ دونوں کے لئے قیامت کی عدالت، انسان کی کمزور نظر کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھتی ہے۔ لیکن میری روشن آنکھ نے روشنی میں اس دُنیا سے اُس طرف کچھ نہیں دیکھا۔

"میں دیکھ رہا ہوں۔ دونوں جمنا کے کنارے پر کھڑے ہیں۔ نئی شادی نئی جوانی، مخمور آنکھوں کو پانی میں میرا عکس اندر سیھا معلوم ہوتا ہے۔ فضا محبت کے گیت گا رہی ہے۔ آسمان پر کوئی ایک راستہ بھولا ہوا، بادل کا ٹکڑا نظر آیا۔ اُسنے کہا 'دیکھو! دیکھو! گھنشام رادھا کا انتظار کر رہے ہیں'۔

'نہیں، نہیں! میری رادھا میرے پاس ہے'

اُن کے جسموں سے شعاعیں نمودار ہوگئیں، تیز چمکدار شعاعیں، شعاعیں ایک دوسرے میں جذب ہوگئیں۔

چاندنی مدھم پڑگئی، دُنیا غائب ہوگئی۔ شعاعیں، صرف شعاعیں۔

آخر تمتماتے ہوئے رخساروں کے نیچے اُس کے تھرکتے ہوئے سرخ ہونٹ جنبش میں آئے۔

'ہیں۔ ہیں! یہ جمنا ہے، ماتا جمنا، پوتر جمنا،

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے نازک ہاتھوں سے گلاب کا پھول پانی کے نذر کر دیا۔ اُس نے اپنے ہاتھ کا پھول جمنا میں پھینک دیا۔ ایک موج نے دونوں [illegible]لوں کو اکٹھا کر دیا۔ پھول جا رہے ہیں، کہاں جا رہے ہیں؟ میں بھی نہیں جانتا"

میں دیکھ رہا ہوں، وہ اپنے صحن میں امرود کے درخت کے نیچے، ایک شاخ کو پکڑے کھڑی ہے، تنہا، مغموم، خاموش، اُس کے دائیں ہاتھ میں کاغذ چمک رہا ہے، اُس کی دونوں آنکھوں میں آنسو جھلک رہے ہیں، پچھلے خط میں انھوں نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ کہتے تھے تم کو ساتھ ہی لے جائیں گے اور اس خط میں کیا لکھا ہے؟ خط کو بار بار پڑھنے سے پریشانی بڑھتی ہے۔ وہ اُن روح فرسا الفاظ کو پھر دیکھنا چاہتی ہے۔ چاندنی میں آنسوؤں میں سے الفاظ اُچھلتے معلوم ہوتے ہیں۔ 'جنگ شروع ہوگئی ہے، رخصت نہیں مل سکتی' مضمحل آنکھوں نے چند لمحے مضمحل غصے سے کاغذ کی طرف دیکھا، خیالات کی دنیا نزدیک تھی مجبوری نے وہاں پناہ لی۔

'جنگ! معصوم انسانوں کو قتل کر ڈالنے کی اجازت، کیا میں بھی اُن کو قتل کر سکتی ہوں، جنھوں نے میرے سرتاج کو ایک نامعلوم وقت کے لئے مجھ سے چھین لیا ہے۔ نہیں، بدھو تانگے والے نے ایک بدمعاش مہاجن کو قتل کیا تھا، اُس کو پھانسی کی سزا ہوگئی۔ مدت ہوئی اُس نے مہاجن سے ۲۰ روپئے قرض لئے تھے۔ سود سے ۵۰۰ روپے ہوگئے۔ بدھو کے ہاں فاقے پر فاقے ہوتے تھے، بیوی سے فساد رہتا تھا۔ ایسے ہی کسی دن مہاجن روپے کا مطالبہ کر آیا ہوگا۔

بڑھو تے اُس کے تقاضوں کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔ جانتا تھا موت زندگی سے بہتر ہے۔ سود کے خونخوار دانتوں سے لوگوں کا خون چوسنے والوں کو قتل نہ کرو، یہ جرم ہے، کسی کے قیمتی تاج کے قیمتی ہیروں کو چرانے والوں کا خون نہ بہاؤ، یہ گناہ ہے، لیکن جب کوئی چھوٹا سا معصوم بچہ اپنی ماں سے روٹی کا تقاضا کرے، اور وہ اُس کی ننھی سی اُنگلی پکڑ کر اُس کو بازار کی طرف لے جائے، تو دوربین سے اُن کی تمام حرکات کا مطالعہ کرتے رہو اور جب بالآخر ایک دوکان پر پہونچکر بچہ انتہائی مسرت کے ساتھ پہلا نوالا اپنے منھ میں ڈالنے لگے، تو اُس پر ایک ٹن کا قیامت خیز بم گرا دو۔ اُس کو، اُس کی ماں کو دوکاندار کو، اُس کی دوکان کو فنا کر ڈالو۔ یہ جرم نہیں۔ کالے کالے گندے کپڑوں والے کان کن مزدور کو آج تنخواہ ملے گی گھر پر اُس کا انتظار ہو رہا ہے۔ تنخواہ والے دن کھانے پینے اور دوسری آسایش کی چیزوں میں خاص اہتمام سے کام لیا جاتا ہے، اور آج تو اُس نے تمام کنبے کو سنیما دکھانے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ خفیہ سراغرسانی سے ان تمام حالات پر نظر رکھو اور جب وہ مزدور تمام دن کی عرق ریزی کے بعد اپنی پیشانی سے کالے رنگ کا گندہ پسینہ نچوڑ کر باہر نکلنے کے لئے اپنے کندھے پر اپنا بیلچہ رکھے، تو کان کو آگ لگا دو۔ ساری زمین دوز دنیا کو امیدوں کا قبرستان بنا ڈالو۔

کیا تمھاری بندوق کے سامنے بھی ایسے لوگ کھڑے ہیں، جن کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ جنھوں نے اپنے من کی جہازیوں کو لکھا ہے: جنگ شروع ہو گئی ہے، رخصت نہیں مل سکتی۔ جن کے دلوں میں جوانی کی امنگوں نے ابھی ابھی آنکھ کھولی ہے جو زندگی کی مسرتوں اور محبت کی رنگینیوں کا استحقاق رکھتے ہیں ---- اور تم اُن کو ---- نہیں نہیں ---- ایسا نہ کرنا ---- ایسا نہ کرنا۔ انتظار کرنے والے دلوں کی آہیں ---- اور ---- لیکن ---- اگر انھوں نے تم کو ---- خدا نہ کرے ---- دل میں نامراد خیالات کیوں اُٹھتے ہیں ---- میں کیا کروں ----"

اس کے بعد آنسو - آنسو - آنسو"

میں دیکھ رہا ہوں، ایک جہاز جا رہا ہے، جنگی جہاز۔ میں نے بہت سے جہاز دیکھے ہیں۔ اُن میں کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہوتی، میں نے آج تک کسی کو توجہ کے ساتھ نہیں دیکھا، اِس جہاز میں کیا کشش ہے؟ توپ کے پاس ایک ملاح کھڑا ہے اور بھی ملاح ہیں، ڈیوٹی پر مجھے اُن کی پرواہ نہیں، اُن کو میری پرواہ نہیں، وہ ڈیوٹی سے زیادہ کسی اور اہم جاذبیت کے اثر میں ہے، وہ کھڑا ہے، خود سے بے خبر، جہاز سے بے خبر، دنیا سے بے خبر، وہ بے خبر نہیں، وہ عالمگیر تخیل کے پر رکھتا ہے۔ وہ میرا گیت سنتا ہے، میں نے کہا:

ایک غریب کسان کو ایک کروڑپتی کی کار نے کچل ڈالا۔

وہ بھاگتا ہوا وہاں گیا، اُس کے بے قرار دل میں قیامت برپا ہو گئی۔ اُس نے کہا:

"میں سوسائٹی کو جگانا چاہتا ہوں"

میں اُس کو ایک خوبصورت عورت کی خوبصورت بلڈنگ میں لے گیا، تنہائی کی محفل میں شمع تنہا جل رہی تھی اُس نے کہا:

سنبھل! اجل، اور اپنی طرف دوڑنے والے تمام پروانوں کو بھی جلا کر خاکستر کردے۔

اُس نے میری آنکھوں سے ایک آدمی اور ایک عورت کو گفتگو کرتے دیکھا، اُس نے کہا:

'خوبصورت عورت کی خوبصورت بلڈنگ سے باہر نکل کر فلسفہ عملی شکل اختیار کرے گا'

میں اُس کو مردہ خانے میں لے گیا، پوسٹ مارٹم ہو رہا تھا۔ اُس نے کہا:۔

'خون کے چھینٹے سوسائٹی کے چہرے کو بدنما کردیں گے، سوسائٹی چونک جائے گی'

وہ میرے ساتھ جمنا کے کنارے پر گیا، اُس نے شعاعوں کو دیکھا، تخیلات لے ساتھ چھوڑ دیا، جذبات سُن ہوگئے، زبان ساکت ہوگئی، وہ چپ تھا، چپ رہا، میں سمجھ گیا، اُس کو کشاں کشاں امرود کے درخت کے پاس لے گیا۔ قیامت ہوگئی، اُس کی خاموشی آنسوؤں میں بدل گئی۔

"اب مجھے گانا نہیں چاہئے"

گیت ختم ہوگیا، میں نے دیکھا، میں توپ کے پاس کھڑا ہوں، سرگرانی محسوس کرتا تھا، بایاں رخسار نال پر رکھ دیا۔

یکایک کان میں آواز آئی:۔ "پاگل"

میں چونک گیا، بندوق کی آواز تھی: "نال کے سامنے آجا، دل کے کانوں سے سُن!"

میں غیر ارادی طور پر نال کے سامنے چلا گیا۔ "تو سوسائٹی کو جگانا چاہتا ہے، تو، چاندنی کے گہوارے میں مدہوش سو جانے والا۔ چاندنی کی موسیقی میں بے اختیار ہو جانے والا، زرد رو کمزور چاندنی۔ اس کی ناتمام کوشش تو تمام کائنات کی ظلمت کو بھی نہیں مٹا سکتی، جہاں ظلمت مٹ جاتی ہے۔ وہاں مٹی چاندی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ لوگ سفید کپڑے پہن لیتے ہیں جہاں چاندنی نہیں پہونچ سکتی وہاں مٹی میں کانٹے نظر نہیں آتے، لوگ کالے کپڑے پہنتے ہیں۔ سفید کپڑوں والے اپنا کام کالے کپڑوں والوں کو سنبھال کر سو جاتے ہیں، چاندنی کے گہوارے میں، چاندنی کی موسیقی میں، چاندنی جگا نہیں سکتی، سوسائٹی کو جگانے والی چیز صرف ایک ہے، اٹھارہ انچ والی توپ کی گرج۔ غفلت کی دیواریں گر جاتی ہیں۔ کھولت کے پردے پھٹ جاتے ہیں، بیکاری کی لعنت مٹ جاتی ہے، کمزور پیروں والے معدوم ہو جاتے ہیں۔ ایک مقام کا فلسفہ دوسرے مقام پر قیامت کی رفتار سے جاتا ہے، خون کے چھینٹے اُڑ کر سوسائٹی کی دیوار کو خراب کر دیتے ہیں۔ خاموش رہنے والوں کو سنگسار کر دیا جاتا ہے آنسو بہانے والوں کو مسمار کر دیا جاتا ہے۔ زندگانی ایک جہاد ہے۔ اس جہاد میں سب سے زیادہ ہمت رکھنے والا زندگی کا حقدار ہے۔ جنگ دنیا کے تمام مسئلوں کا واحد حل ہے"

پریشانی کی ایک چیخ کے ساتھ میں نے کہا:۔ "میں نہیں سمجھا، میں نہیں سمجھ سکتا، میں نہیں سمجھنا چاہتا"

ایک دھماکا ہوا، پچاس پاؤنڈ کے ایک شیل نے میرے سر کو میرے جسم سے الگ کر دیا۔

ابھی تک زندہ ہوں ——— جسم رکھتا ہوں، سر نہیں رکھتا۔

انور

اڈیٹر "نگار" اور کلام اللہ

قرآن مجید کے متعلق مسٹر نیاز نے جو کچھ نگار میں لکھا اور علماء کے ایک گروہ نے جس طور سے ان کی تکفیر کی ہے اُس سے مجھے روحانی تکلیف ہے اور میں دونوں سے دردمندانہ لہجہ میں شکایت کرتا ہوں۔ علماء سے اس لئے کہ ایک "کافر ادب" کو مسلمان بنانے کی کوشش باحسن وجوہ کی جاتی لیکن برخلاف اس کے تضحیک و توہین اور بزدلی کے طعنوں سے اس کے "شعلۂ کفر" کو اور تیز کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح مسٹر نیاز سے بھی شکایت ہے کہ ان کے نزدیک جب "احادیث و تفاسیر اور اقوال سلف سب جھگڑے کی چیزیں ہیں" تو ان کو ایک ادبی رسالہ میں جو نوجوانوں میں مقبول ہے جگہ دینا فتنہ کا دروازہ کھولنا ہے لیکن اگر نیاز کا نازادیبانہ آزاد خیالی کے نشہ میں ان کو ناوک افگنی پر مجبور کر رہا ہے تو خدارا "مرغ قبلہ نما" کو اس کے "آشیانے" میں نہ تڑپائیں۔ مانا کہ "عبد الماجد اینڈ کو" نے اپنے عہد کو توڑا اور بدعہدی کے کنوئیں میں گر پڑے لیکن نیاز بے نیاز کی یہ شان نہیں کہ وہ خود بھی معذرت نامہ کو بالائے طاق رکھکر نقض عہد کے کنوئیں میں پھاند پڑے۔

شکایت تو ہو چکی اب دردِ دل کا اظہار کیونکر ہو۔ کیا کلام کے ذریعہ سے ؟ لیکن کلام کا ہی تو جھگڑا ہے، گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ یہ جھگڑا اصل میں مسیحیت کے عقیدہ (Logos) لوگاس یعنی "ورڈ آف گاڈ" کا پیدا کیا ہوا ہے۔ دوسری صدی عیسوی میں انجیل یوحنا جب لکھی گئی تو اس کا آغاز یوں کیا گیا:-

"ازل میں کلمہ تھا۔ کلمہ خدا کے ساتھ تھا۔ کلمہ خدا تھا۔ کلمہ مجسم ہوا اور ہمارے پاس مقیم ہوا"

یہ تعلیم یونانی فلسفہ کے رنگ میں ذات و صفات کی عینیت۔ حدوث و قدم اور مخلوق و غیر مخلوق کی بحثوں میں پھنسکر وجود ابن مریم کے لئے ایک معما بن گئی۔ فرقہ بندیاں شروع ہوئیں دار و گیر اور باہمی تکفیر کا ہنگامہ گرم ہوا اور پیروان مسیح کی یہ حالت ہو گئی کہ "فنسوا حظا مما ذکروا بہ"

مسلمانوں میں یہ بلا اموی دور سے پھیلنا شروع ہوئی جب دمشق کے ایک عیسائی فلسفی سنٹ جان (جسکا باپ سر جیس خلیفہ عبد الملک کا خزانچی تھا) کی تعلیمات سے متاثر ہوکر معتزلہ نے یہ پرانا "لوگاسی" غلاف مصحف پاک پر چڑھا دیا اب وہی مخلوق و غیر مخلوق حادث اور قدیم کی خشک بحثیں چھڑ گئیں اور آزاد خیالی کا نشہ اتنا تیز ہوا کہ معتزلہ نے علانیہ کہنا شروع کیا کہ جو کوئی قرآن کو قدیم اور غیر مخلوق کہے وہ موحد نہیں۔ خدا کی عظمت اسی میں ہے کہ قرآن کو مخلوق و حادث کہا جائے

اس پر غضب یہ ہوا کہ جب مامون رشید خلیفہ ہوا تو اس نے اس عقیدہ کو بزور شمشیر پھیلانا شروع کیا اور ان فقہا و محدثین کو جو قرآن مجید کو الفاظ و معنی ہر حیثیت سے کلام خدا یقین کر کے اس کو قدیم اور غیر مخلوق کہتے تھے اور جن کے سر گروہ امام احمد بن حنبل تھے ظلم وستم کا تختۂ مشق بنا دیا لیکن جب چند سال بعد متوکل خلیفہ ہوا اور حنابلہ کا زور ہوا تو معتزلہ کا تختہ اُلٹ گیا اور ان پر ویسے ہی ظلم وستم ہونے لگے جیسے انھوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں کئے تھے۔ ان کے زوال کے ساتھ ان کے عقاید متعلق صفات و رویت باری تعالیٰ۔ کلام اللہ اور مفہوم رسالت وغیرہ وغیرہ کتابوں میں باقی رہ گئے جن کو اڈیٹر نگار نے اس دور فتنہ میں ان زنادقہ کے رنگ میں جنھوں نے عباسیوں کے دور میں الحاد کا راگ اعتزال کے پردہ میں گایا تھا پیش کیا ہے۔ کاش مسٹر نیاز قرآن پاک کی دعوت علم وعمل کے انوار سے دلوں کو اپنی شگفتہ تحریر سے روشن کرتے اور "منطوق خداوندی" کی موشگافیوں میں نہ اُلجھتے!

مسٹر نیاز احادیث وتفاسیر اور اقوال سلف کے عوض قرآنی شہادت اور عقلی دلیل چاہتے ہیں اچھا یوں ہی سہی پہلے وہ ولید ابن مغیرہ کا واقعہ یاد کریں جب اس نے کفار قریش کے استفسار پر قرآن مجید کو "ان ہذا الا قول البشر" کہدیا۔ اب اگر قرآن واقعی رسول اللہ کا قول تھا تو آپ صاف اقرار کر لیتے کیونکہ آپ کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے جیسا کہ اڈیٹر نگار نے بھی جون کے پرچے میں لکھا ہے کہ "میں یقین رکھتا ہوں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے" لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ ولید کے اس دعوے پر "ساصلیہ سقر" کی وعید کا اعلان کیا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن آپ کا قول نہ تھا پھر کس کا تھا؟ ارشاد ہوتا ہے:-

انہ لقول رسولٍ کریم ذی قوۃٍ عند ذی العرش مکین مطاع ثم امین وما صاحبکم بمجنون ولقد راٰہ بالافق المبین وما ھو علی الغیب بضنین وما ھو بقول شیطان الرجیم فاین تذھبون ان ھو الا ذکرٌ للعالمین۔

(سورہ التکویر)

بیشک یہ قول ہے ایک بھیجے ہوئے عزت والے کا قوت رکھتا ہے مالک عرش کے پاس درجہ پایا ہوا سب کا مانا ہوا پھر معتبر۔ اور یہ تمھارا رفیق کچھ دیوانہ نہیں ہے اور اس نے اس کو آسمان کے کھلے کنارے پر دیکھا ہے اور یہ غیب کی بات پر بخیل نہیں ہے اور یہ کسی مردود شیطان کا کہا ہوا نہیں ہے پھر تم کدھر چلے جاتے ہو۔ یہ تو ایک ذکر ہے سارے عالموں کے لئے۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم اور صاحبکم دو جداگانہ ہستیوں کی طرف اشارہ ہے صاحبکم سے مراد قریش کے صاحب یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور رسول کریم سے فرشتہ روح الامین جس کو افق مبین پر دیکھا۔ ایسی صورت میں "منطوق خداوندی" کی بحث باقی نہیں رہتی۔ وہی روح الامین جو حضرت مسیح پر بشکل کبوتر نازل ہوا (انجیل مرقس باب اول) وہی آنحضرت صلعم پر بشکل بشر نازل ہوا پھر اگر صورت بشری میں معانی الفاظ کی شکل میں سنائی دے تو اشکال کیا ہے یہ الفاظ گوش دل نے سنے اور دیدۂ باطن نے دیکھے۔ "نزل بہ الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین"۔

اب ایک دوسری آیت سنو :-

لاتحرک بہ لسانک لتعجل بہ ان علینا جمعہ وقرانہ فاذا قراٰنٰہ فاتبع قرانہ ثم ان علینا بیانہ ۔

(سورہ القیامہ)

اپنی زبان اسکے جلد سیکھ لینے کے لئے نہ چلاؤ یہ ہمارا ذمہ ہے کہ اسکو جمع کردیں اور پڑھیں پھر ہم جب پڑھنے لگیں تو اس پڑھنے کے ساتھ رہو پھر مقرر ہمارا ذمہ ہے اس کو بیان کرنا

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ اس قرأت کا اتباع فرماتے تھے جو آپ کو سنائی جاتی تھی لفظ قرأت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صرف "نزول احکام علیٰ وجہ البصیرت" نہ تھا (جیسا کہ اڈیٹر نگار نے لکھا ہے) بلکہ جلوہ معانی لباس الفاظ میں تھا لیکن کس طور سے یہی اصل مشکل ہے جس کا حل تشبیہ اور تنزیہ کے دقایق پر غور کرنے سے ہوتا ہے۔ جو درج ذیل ہیں

تشبیہ اظہار مافی الضمیر کا ایک لطیف پیرایہ ہے اور شاعری کا حسن ہے لیکن دنیائے مذہب میں اس قسم کے تشابہات گمراہی کی طرف کھینچ لیجاتے ہیں۔ دیکھو عہد عتیق کتاب ہوشع ۱۱ میں خداوند یہوہ فرماتا ہے "میں اپنے فرزند اسرائیل کو مصر سے نکال لایا" اس رافت و رحمت خداوندی کے تصور سے حضرت مسیح یہود کو تعلیم دیتے وقت خداوند یہواہ کو "آسمانی باپ" کہکر یاد کرتے ہیں جس سے آپ کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح باپ اپنے سرکش فرزند کو تادیب کے طور پر سزا دیتا ہے اسی طرح خداوند یہواہ ۔ نے جو دنیاوی مصائب یہود پر انکے شامت اعمال کے باعث نازل کئے وہ شفقت پدرانہ کے طور پر ہیں نہ انتقام وقہر محض لیکن دیکھو نصاریٰ نے اس موثر تشبیہ کے مفہوم میں کیسی غلطی کی کہ جوش غلو میں حضرت مریم کو "مادر خداوند" اور اس پیغمبر معصوم کو خدائے لم یلد ولم یولد کا اکلوتا بیٹا سمجھکر پرستش کرنے لگے اور تثلیث کے قایل ہو گئے۔

تنزیہ کی بھی یہی کیفیت ہے کہ اگرچہ وہ ذہن انسانی کو تجسیم کے دلدل سے نکال کر اعلیٰ اور ارفع تخیل کے سرائے سرور میں پہونچا دیتی ہے لیکن جب اس میں غلو ہو جاتا ہے تو لا ادریت اور انکار وجود کے بیابان میں پھینک دیتی ہے جیسا کہ قدیم زمانہ میں مذہب بودھ اور زمانہ حال میں حکمائے اسپنوزا اور اسپنسر وغیرہ کی تعلیمات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسلام نے صراط مستقیم کی تعلیم دی ہے اور تشبیہ اور تنزیہ کے تصور میں ایک اعتدال پیدا کر دیا ہے۔ دیکھو کلمہ طیبہ میں نفی الٰہی ہو اور اثبات اللہ بھی لاتدرکہ الابصار بھی ہے اور وجوہ یومئذ ناضرہ الی ربہا ناظرہ بھی ہے۔ ید اللہ فوق ایدیہم بھی ہے سمیع بصیر بھی ہے اور لیس کمثلہ شئی بھی۔ کلام کے متعلق بھی یہی اعتدال پیش نظر ہے۔ منطقی دماغ کے لئے یہ تضاد ایک ناقابل عبور خلیج ہے لیکن قلب سلیم کے لئے لا اور الا کی نورانی فضا میں برق حقیقت طپاں ہے جس کی روشنی میں "فاوحیٰ الی عبدہ ما کذب الفواد ما رایٰ افتمرونہ علیٰ مایریٰ" کے معانی منکشف ہوتے ہیں۔ اس لئے "لوگا سی معما" اور معتزلہ اور حنابلہ کی چہ میگوئیاں ان سب کو چون و چرا حقیقت رہ افسانہ زدند سمجھکر کل من عند ربنا پر ایمان لانا چاہئے۔ مسٹر نیاز نہیں غالب نے خوب کہا ہے :-

مطلب ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

تشبیہ و تنزیہہ کے دقائق پر غور کرنے کے بعد اب پھر سورۂ قیامت کی مذکورہ بالا آیات پڑھو: "ان علینا جمعہ و قرانہ فاذا قرانہ فاتبع قرانہ ثم ان علینا بیانہ"۔ جمع قرآن قرأت قرآن بیان قرآن ان سب کو خدا نے اپنے ذمہ لیا پھر تاریخ شہادت دیتی ہے کہ یہ وعدہ الہٰی کیسا سچا ہوا۔ دیکھو حفاظت قرآن کا طریقہ کیسا پاکیزہ اور مستحکم تھا حضرت موسیٰ کو الواح پر لکھے ہوئے احکام ملے مگر وہ احکام دستبرد زمانہ سے غارت ہو گئے اور توریت میں تحریف ہو گئی۔ لیکن قرآن ابتدا ہی سے حفاظ کے لوح سینہ میں محفوظ ہے اور قیامت رہے گا۔ کیا یہ حیرت انگیز امر نہیں ہے کہ دنیا کی کوئی الہامی کتاب اس شرف سے فائز نہیں ہے۔ پھر جمع قرآن کا تمام صحف سماوی سے رنگ جدا ہے دنیا میں جس قدر الہامی کتابیں ہیں ان میں کلام بشر مخلوط ہے لیکن یہاں کلام محمد صلعم جن میں آپ کے خطبات ادعیہ ماثورہ سفر و حضر اور خلوت و جلوت میں گفتگو جو اگرچہ "ماینطق عن الہویٰ" کے تحت میں تھے سب کے سب قرآن سے بالکل الگ ہیں اور کلام اللہ آفتاب دلیل آفتاب ہے

اب ہم علامہ سید رشید رضا (جو زمانہ حال کے ایک مشہور محقق ہیں) کی ایک عبارت کا ترجمہ کتاب "وحی محمدی" سے ذیل میں نقل کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ "عبدالماجد کا ایک ملحد" جس کی خوبی یہی ہے اگرچہ ضد کی اور بات ہی مان جائے اور ساتھ ہی "نیاز کا ایک مسلمان" بھی معترض نہ ہو۔

"قرآن کے کلام اللہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا کے منھ ہے اور زبان ہے جس سے وہ بولتا ہے یا یہ کہ خدا آدمی کی صورت میں آتا تھا اور باتیں کرتا تھا جیسا کہ تورات میں کہا گیا ہے بلکہ ہم مسلمانوں کے یہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ وحی اللہ کی طرف سے ایک خاص طریقہ کی تعلیم ہے جو انسانی تعلیم کی طریقوں سے مختلف ہے جیسا کہ خدا خود فرماتا ہے "الرحمن علم القرآن" اور فرمایا نزل بہ الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین"۔ ہم مسلمانوں کے یہاں اللہ کا کلام اس کی ایک شان اور اس کے علم کی طرح اس کی کمال ایک صفت ہے اس کا علم یہ ہے کہ ہر قسم کے معلومات اس پر ہمیشہ سے منکشف ہیں اور کبھی کوئی بات اور کوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں ہوئی نہ ہو سکتی ہے اور یہ کہ اس کے کلام سے مقصود یہ ہے کہ جو معلومات جس پر چاہتا ہے ظاہر کر دیتا ہے۔ آدمی اپنا کلام دوسرے آدمی تک اپنی زبان سے قلم سے اشارہ سے آلات سے پہونچاتا ہے مگر خدا اپنا کلام وحی کے ذریعہ پہونچاتا ہے جس کی حقیقت فرشتوں اور پیغمبروں کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ وحی کی تین قسمیں ہیں جیسا کہ سورۂ شوریٰ میں ارشاد ہوتا ہے "وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ ما یشاء انہ علی حکیم اللہ تعالےٰ کا علم اس کا کلام اور اس کا بات کرنا اس کی دوسری صفتوں کی طرح انسانی صفات سے مشابہ نہیں ہے لیس کمثلہ شیئ وہو السمیع البصیر"۔

قصص قرآنی کے متعلق مسٹر نیاز نے جو یہ لکھ دیا کہ:۔

"چونکہ توریت و انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قائم تھا اس لئے رسول اللہ نے بھی ان کو محض

اعتبار و بصیرت کے لئے بیان کر دیا اور اس نے کوئی بحث نہیں کی کہ وہ صحیح ہیں یا غلط"۔
نا فہمی پر مبنی ہے اور حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ اہل کتاب نے تورات و اناجیل میں جو ناپاک روایتیں وحی کے ساتھ مخلوط کر دی ہیں مثلاً حضرت لوطؑ اپنی دختروں سے زنا کرتے ہیں (کتاب پیدائش ۱۹/۳۰-۳۸) - حضرت ہارونؑ سونے کا بچھڑا بنا کر بنی اسرائیل سے غیبت موسیٰؑ بجواتے ہیں (کتاب خروج باب ۳۲) حضرت موسیٰؑ پیتل کا سانپ بناتے ہیں (کتاب اعداد ۲۱/۹) حضرت داؤدؑ زوجہ اوریا سے زنا کرتے ہیں (کتاب دوم صموئیل ۱۱/۲-۱۳) حضرت سلیمانؑ اپنی ازواج کی خاطر بت پرستی کرتے ہیں (اول ملوک ۱۱/۳-۸) حضرت داؤدؑ یہودا کے حرامی بیٹے فرص کے اولاد سے ہیں (اول تاریخ الایام ۲/۴-۱۵) پھر حضرت مسیحؑ اسی داؤد کی نسل سے ہیں (انجیل متی ۱/۳-۱۶) نعوذ باللہ من ہفواتہم۔ غرضکہ ان تمام ناپاک روایتوں کی دھجیاں ایک امیؐ (روحی فداہ) کی زبان پاک سے اڑا دی جاتی ہیں ارشاد ہوتا ہے "اِنَّ ھٰذا القرآن یقص علےٰ بنی اسرائیل اکثر الذی ھم فیہ یختلفون وانہ لھدیٰ ورحمۃٌ للمومنین"۔ (سورہ النمل)

آج سے پچیس سال ہوئے جب مینے کتاب تاریخ صحف سماوی میں ان تمام روایتوں پر قرآن پاک کی روشنی میں بحث کر کے اسرائیلیات کی قلعی کھولی تھی اور دکھایا تھا کہ تاریخی اور نفسیاتی حیثیت سے قرآن مجید نے تورات و اناجیل میں کس طرح اصلاح کی ہے پھر توریت کے قصہ یوسفؑ کا موازنہ قرآن مجید کے احسن القصص سے ساٹھ صفحوں میں درج کر کے اصل حقیقت کو آئینہ کیا تھا مسٹر نیاز نے شاید وہ کتاب نہیں دیکھی ورنہ مسلمان ہو کر غیر مسلموں کی طرح قصص قرآنی کو معاذ اللہ اہل کتاب کی کورانہ تقلید نہ سمجھتے

آخر میں نگار۔ صدق اور معارف کے اڈیٹروں کو اسلامی اخوت کی بنا پر یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ خدا را اس باہمی خانہ جنگی سے باز آئیں اور واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً پر عمل کر کے پیر دائی حیثیت سے نوجوانان ملت کے لئے چراغ ہدایت بنیں لیکن اگر بدقسمتی سے اڈیٹری کا یہ ترنگی جھنڈا ایک ہی قومی نشان نہ بن سکے تو پھر معارف کے فاضل اڈیٹر سے میں ایک تقاضا کرونگا وہ یہ کہ علامہ شبلی مرحوم نے میری استدعا پر اپنے ایک کرمنامہ میں وعدہ کیا تھا کہ سیرۃ النبیؐ کے سلسلہ میں وہ ایک مستقل جلد کلام مجید پر لکھیں گے۔ اُستاد مرحوم کے اس وعدہ کو کیا ان کا لایق شاگرد اور جانشین "کافرادپ" سے اُلجھ کر بھول جائے گا۔

من انچہ شرط بلاغ است باتو می گویم تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

(پروفیسر) نواب علی (ام۔اے)

(نگار) پروفیسر نواب علی صاحب ام۔اے کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس مسئلہ پر ایک سنجیدہ انسان کے نقطۂ نظر سے غور

۱؎ اس کتاب کو میں نے طبع کرا کر اُسی زمانہ میں اسکے نسخے دار المصنفین میں بھیج دئے تھے اور لکھدیا تھا کہ دوسرا اڈیشن وہ خود طبع کریں۔ کتاب عرصہ سے نایاب ہے مگر اس کا دوسرا اڈیشن ابتک شایع نہیں ہوا۔ مسٹر نیاز اس کا نسخہ امیر الدولہ اسلامیہ اسکول لائبریری سے مطالعہ کے لئے منگوا سکتے ہیں۔

فرمایا اور مجھے سمجھانے یا میرے شبہات دور کرنے کے لئے وہ بازاری وعامیانہ طریقہ اختیار نہیں کیا، جو عبدالماجد وشرکاؤہ "کا دیرینہ شعار ہے۔

میں اس مسئلہ پر اب اسوقت تک بحث نہ کروں گا جب تک فاضل مقالہ نگار کی کتاب "تاریخ صحف سماوی" کا مطالعہ نہ کرلوں۔ میرے ان کے درمیان "کلام اللہ" کے عقیدہ کے متعلق بظاہر بہت کم اختلاف پایا جاتا ہے۔ میں بھی قرآن مجید کو وحی والہام کا نتیجہ سمجھتا ہوں، لیکن صرف مطالبِ قرآن کی حد تک، اور ہر چند الفاظِ قرآنی انسانی کلام ہیں، لیکن چونکہ وہ نتیجہ ہیں ایک مخصوص "وجدان" کا اس لئے لفظی حیثیت سے بھی میں ان کا مرتبہ بہت بلند سمجھتا ہوں۔ (اسی ماہ کے باب الاستفسار میں، اس پہلو پر میں نے اظہار خیال کیا ہے، ملاحظہ فرمایئے)

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں جو قصص بیان کئے گئے ہیں وہ اسرائیلیات سے کچھ مختلف ہیں، لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کو صحیح باور کرنے کے لئے ہمیں عقل کو نظرانداز کردینا ضروری ہوجاتا ہے اور یہی پہلو ہمیشہ میری نگاہ میں کھٹکا ہے۔

بہرحال اس باب میں تفصیل کے ساتھ پھر اپنے خیالات پیش کروں گا اور میں ممنون ہوں گا اگر پروفیسر نواب علی صاحب کی رہبری وہدایت سے میں حقیقت تک پہونچنے میں کامیاب ہوگیا۔

میں نے کبھی کسی مسئلہ کے سمجھنے میں ضد سے کام نہیں لیا، کیونکہ میں ہر چیز کا مطالعہ ایک طالب علم کی حیثیت سے کرتا ہوں اور معقول بات کو ماننے کے لئے ہر وقت طیار رہتا ہوں۔

کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ پروفیسر صاحب قرآن مجید کے متعلق مروجہ عقیدہ و روایات کو سامنے رکھکر وحی والہام اور لوح محفوظ کے متعلق اپنی رائے زیادہ واضح الفاظ میں قلمبند فرمادیں۔

اس مقالہ میں جن دلایل سے کام لیا گیا ہے، اُن پر بہت کچھ کہا جاسکتا ہے، لیکن میں اس کو نظرانداز کرتا ہوں کیونکہ میرا مقصود اس سلسلہ کو آگے بڑھانا نہیں ہے، مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا اور اب یہ معلوم کرکے مطمئن ہوں کہ اہل علم کی ایک جماعت اس باب میں میری ہم آہنگ ہے۔

پروفیسر صاحب نے ایک جگہ یہ فرمایا ہے کہ اگر رسول اللہ کو صادق القول مانا جاتا ہے تو اُن کے اس قول کو بھی صحیح باور کرنا چاہئے کہ قرآن خدا کا کلام ہے۔

یقیناً رسول اللہ کا ایسا فرمانا بالکل درست ہے، لیکن گفتگو تو اسی میں ہے "کلام" سے مراد کیا ہے۔ رسول اللہ نے کبھی یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ قرآن کے الفاظ خدا کے بتائے ہوئے الفاظ ہیں۔ آپ نے مُطلقاً اسے کلام الہی سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی خدا کی بتائی ہوئی بات کے بھی ہوسکتے ہیں اور اسکو ہر مسلمان تسلیم کرتا ہے کہ قرآن کی ہدایات واقعی ہدایاتِ خداوندی ہیں۔ اگر "فاتوا بسورۃ من مثلہ" کا مطالبہ کیا گیا تھا تو اس سے مراد الفاظ نہ تھے بلکہ قرآن کی روح، قرآن کی تعلیمات اور اسکی ہدایات مراد تھیں۔

میں قرآن کو اسی معنی میں "کلام اللہ" سمجھتا ہوں اور غالباً بہت سے علماء کا یہی خیال ہے۔

تہذیبِ حاضر سے!

دشمنِ عیش و طرب ہے گردشِ لیل و نہار — خاک کے تودوں میں ہے تہذیبِ بابل کا مزار
رومتہ الکبریٰ کے کھنڈروں کا پتہ ملتا نہیں — اُڑ چکا کب کا، ہوا میں قیصریت کا غبار
نینوا کے قصر و ایواں اور بابل کے محل — کس قدر ثابت ہوئے اس دہر میں ناپائیدار
عظمتِ فرغانہ باقی ہے، نہ فرِّ سام و کے — لُٹ چکی، کب کی، عراقی مرغزاروں کی بہار
آلِ سیزر کا پتہ دے گی نہ شاید یہ زمیں — جس کے سینہ میں نہاں ایسے ہزاروں ہیں مزار
اس زمیں پر جن کی چوکھٹ چومتا تھا آسماں — صفحۂ تاریخ کی سطریں ہیں اُن کی یادگار
جن کے ماتھے کی شکن سے کانپ جاتا تھا جہاں — درسِ عبرت، اہلِ بینش کو ہے اُن کا حالِ زار
تھی مہیا ہر جگہ جن کے لئے پھولوں کی سیج — اُن کے مستقبل کا عنواں، رحمتِ خاشاک و خار
محفلوں میں وقف تھے ساقی گری کے واسطے — مہوشانِ شوخِ فطرت، شاہدانِ گلعذار
چھیڑتے تھے مطربانِ باکمال و خوش گلو — سازِ رنگیں، بربط و قانون و دف، عود و ستار
جن کی دُنیا رقص، نغمہ، بوئے گل، صہبا و جام — جن کا مشرب عیش، مستی، لذت و کیف و خمار

اُن کو دیکھا ہم نے اس دُنیا میں باحالِ تباہ
اُن کو آخر کر لیا قانونِ قدرت نے شکار

دیکھ! پھر دُنیا نے کروٹ لے کے اک انگڑائی لی — ہوشیار اے نخوتِ تہذیبِ حاضر، ہوشیار!
آندھیاں چلنے لگیں تیری بدولت جنگ کی — تیرے ہاتھوں کس قدر انسانیت ہے بیقرار
ناز تھا تجھ کو بڑا سائنس کی ایجاد پر — اب وہی ایجاد تجھ کو کر رہی ہے خود شکار
کھل چکا ہے دہر پہ تیری بناوٹ کا فریب — ب فضا دُنیا کی ہے تیرے لئے ناسازگار
اب تجھے چلنا پڑے گا دھار پر تلوار کی — خون میں تڑپے گی، تیرے رقص خانوں کی بہار
تو نے شبنم بن کے دُنیا کو بہت دھوکا دیا — کتنا خوں آشام ہے ترا مزاجِ شعلہ بار
تو نے اپنی رنگ رلیوں میں ذرا پروا نہ کی — تجھ کو دی مہلت خدائے منتقم نے بار بار

خود تراشیدہ خیالوں کی ہے اک جوئے کم آب
جس کو سمجھی ہے سیاست بحرِ ناپیدا کنار

جذب کر سکتی نہیں شبنم کو سورج کی کرن
فطرتِ شبنم میں بس جائے اگر خوئے شرار

ہو گئیں بیدار وہ قومیں جو شبنم طبع تھیں
جن کی نرمی پر تجھے حاصل تھا پورا اختیار

یہ زمانہ اب پلٹ کر بھی نہ دیکھے گا تجھے
گوندھتا ہے کون مرجھائے ہوئے پھولوں کے ہار

جن میں رکھے تھے چھپا کر تو نے نشتر تیز تیز
خود بخود وہ آستینیں ہو رہی ہیں تار تار

دیکھ! وہ تہذیب سے تہذیب ٹکرانے لگی
"امن مجھ کو چاہئے" ہر قوم چلانے لگی

امن کا مرکز جہاں میں دینِ اسلام ہے
ہاں! وہی اسلام جو تیرے یہاں بدنام ہے

امن ناممکن "محمدؐ" کی غلامی کے بغیر
جن کی رحمت، جن کی شفقت اس جہاں میں عام ہے

منزلِ اخلاق کو سمجھی ہے تو دشوار تر
اور یہاں پر وہ بقدرِ وسعتِ یک گام ہے

فتحِ مکہ میں کیا تھا قاتلوں کو بھی معاف
یہ رواداری فقط اسلام ہی کا کام ہے

حرفِ "الا اللہ" خود ہے خیر و برکت کا ثبوت
ہر بھلائی کا عمل، اسلام ہی اسلام ہے

پھر نئے سر سے جہاں میں انقلاب آنے کو ہے
پھر حرا کے غار سے حق کا خطاب آنے کو ہے

ایک صف میں کر دیئے تھے جس نے فاروقؓ و بلالؓ
پھر زمانہ میں وہ دورِ کامیاب آنے کو ہے

اے مشامِ جانِ فطرت صد سلام و صد درود
پھر حجازی باغ سے بوئے گلاب آنے کو ہے

نہرِ زرقا[1] سے ہواؤں نے بھری ہیں چھاگلیں
گلشنِ ہستی مبارک ہو سحاب آنے کو ہے

پھر حجازی میکدے سے "شورِ الکوثر" اٹھا
تشنہ کاموں کی طرف دورِ شراب آنے کو ہے

دیکھنا پھر کفر کے خیبر میں ہلچل پڑ گئی
زندگی بن کر جلالِ بوترابؓ آنے کو ہے

بدر کے میداں میں رکھدی جس نے بنیادِ حیات
وہ جلالت پھر برنگِ انقلاب آنے کو ہے

شکر ہے ماہرؔ کی کوشش ہو رہی ہے کامیاب
میری نظموں کا مدینہ سے جواب آنے کو ہے

ماہر القادری

[1] مدینہ منورہ کی نہر کا نام ہے۔

مہاراجہ بہادر کی یاد میں

اے مہاراجہ بہادر اے یمین السلطنة
تو مجسم خیر تھا انساں عبارت تجھ سے تھی

اب کہاں رسم مروت اور کہاں ہندوستاں
آج بھی باقی یہاں رسم مروت تجھ سے تھی

اس زمانے میں کہ ہے معیارِ عزت سیم و سنگ
بینوائی میں بھی ہم جیسوں کی عزت تجھ سے تھی

جس شرافت کی اداؤں پر رہا مشرق کو ناز
اُٹھ گئی اب وہ شرافت، وہ شرافت تجھ سے تھی

بزمِ اربابِ ادب اُجڑی ہوئی محفل ہے آج
بزمِ اربابِ ادب کی ساری زینت تجھ سے تھی

زندہ رکھا تھا سخاوت نے تو خود حاتم کا نام
اور تیرے دور میں زندہ سخاوت تجھ سے تھی

دل سے تیری یاد ہرگز محو ہو سکتی نہیں
اب بھی فانی کو وہی ہے کل جو نسبت تجھ سے تھی

فانی بدایونی

شاعر کا سجدہ

عبودیت سے جو اک روز قلب گھبرایا،
تو نقشِ بندگی دل سے مٹا دیا میں نے

گلا کے آہنی زنجیر آدمیت کی،
نشیمنِ بشریت جلا دیا میں نے

بجھا کے محفلِ ہستی میں ہوش کا فانوس
جنوں کی شمع کو رہبر بنا دیا میں نے

سنہرے ابر سے ٹپکا کے زندگی کی شراب
ضمیرِ دقّت کو بھی تر بتر کرا دیا میں نے

بلند و تیز ہوئی اس قدر مری پرواز
چراغِ شمس و قمر کو بجھا دیا میں نے

لرزتے رہتے ہیں جس جا پہ شہپرِ جبریل
وہاں سے بھی قدم آگے بڑھا دیا میں نے

ستارا اک چمک اُٹھا حریمِ یزداں میں،
فضائے قدس کا پردا اُٹھا دیا میں نے

جبیں پہ اپنی ستاروں کا تاج کج کر کے
اُلوہیت کا چمن جگمگا دیا میں نے

کسی کے نور نے حلقے میں لے لیا مجھ کو
سروش سجدے میں سر کو جھکا دیا میں نے

شرف احمد خاں سروش ملیح آبادی

تجارت

جب ہوئی منشائے فطرت سے دو عالم کی نمود
ہو گیا زینت طرازِ دہر انساں کا وجود
زندگی انگڑائیاں لے کر نمایاں ہو گئی

تھا کوئی گمراہ کوئی مبتلا تخریب میں
دیکھ کر بے ربطیوں کی شدتیں ترتیب میں
عقل کی تخلیق کی روشن دماغی کے لئے

مختلف شعبوں میں تقسیم جہاں داری ہوئی
مجلسِ انسانیت کو فکرِ غم خواری ہوئی
تھرتھرائی علم کی روشن نگاہی ہر طرف

علم کے خورشید کی کرنیں نمایاں ہو گئیں،
رفتہ رفتہ یوں محیطِ بزمِ امکاں ہو گئیں
ہو گیا انسان حیراں شدتِ انوار سے

لی اپنی راہ لی ہر راہ رو نے بے خطر
ترجمانِ حشمت و عزت تھا دامانِ سحر،
ہو چکا تھا اک جہاں قیدِ غلامی میں اسیر

ناگہاں اک برق چمکی اور تارا ہو گئی
زینتِ بامِ حرم، حسنِ کلیسا ہو گئی.
نور اس بجلی کا ہر ذرے کی طلعت ہو گیا

دوڑی دنیا اپنا اپنا کاسۂ غربت لئے
دامنِ حسنِ شفق پھیلا نئی جدت لئے،
دیکھ کر دنیا کو آزردہ، مسرت بخش دی

آسماں کو دینے والے نے دیا رنگِ کبود
مستقل ہنگامۂ نو میں ہوا دورِ جمود
شمعِ ہستی طلعتِ دنیائے امکاں ہو گئی

لذتیں محسوس کرتا تھا کوئی تکذیب میں
ذہن کو انسان کے ڈھالا گیا تہذیب میں
کوئی گنجائش نہ تھی فطرت کے باغی کے لئے

ذہن کی تاریکیوں پر روشنی طاری ہوئی
اک نئے عنوان سے جینے کی تیاری ہوئی
رُک گئی آئی ہوئی مہلک تباہی ہر طرف

دفعتاً یعنی نئی شمعیں فروزاں ہو گئیں
ہر طرف پھیلیں، بڑھیں، جزوِ رگِ جاں ہو گئیں
روح کو آزاد پایا پنجۂ ادبار سے

کوئی خالی ہاتھ لوٹا، کوئی موتی رول کر
اور تھا انسان بالکل بے نیاز و بے خبر
تھا کوئی غربت زدہ کوئی امیر ابنِ امیر

پھر بنی مہتاب، دُنیا کا اُجالا ہو گئی
مختصر یہ ہے کہ جینے کا سہارا ہو گئی
دوسرا اک نام پھر اس کا تجارت ہو گیا

روح و دل میں اک نیا ارماں نئی حسرت لئے
اہلِ دُنیا کے لئے سرشار کیفیت لئے
تھے جو مفلس اُن کو دُنیا بھر کی دولت بخش دی

دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا میں صنعت بڑھ گئی
کم ہوئی رسمِ غلامی جس کی رفعت بڑھ گئی
مطلعِ امید سے جھلکی شعاعِ انقلاب
تھا شریکِ حال کچھ اس درجہ فطرت کا کرم
کامیابی کے ہزاروں ہوگئے ساماں بہم
اب یہاں ذرہ بھی تھا مہرِ درخشاں سربسر
صنعت و حرفت ہوئی یوں زینت افزائے جہاں
نکبت و افلاس کا ملتا نہ تھا کوئی نشاں
آسماں کو بھی زمینِ ہند پر تھا فخر و ناز،
دیکھ کر ذوقِ تجارت اہلِ عالم دنگ تھے.
الغرض شانِ امارت کے نرالے ڈھنگ تھے
شرق سے تا غرب تھی اک دلکشی چھائی ہوئی
یاد ایامِ تجارت کا وہ دورِ بہتریں
بے نیازِ کلفت و آلام تھے اس کے مکیں،
چاند اپنے نور کے دریا بہاتا تھا یہاں
یاد ایامے کہ جب تھا رایتِ صنعت بلند
تھا نہ خوفِ نامرادی اور نہ کچھ بیمِ گزند
آشنا تہذیب اپنی مرکزیت سے ہوئی
رفتہ رفتہ ہند اک دار التجارت بن گیا
اس قدر چمکا کہ اک قندیلِ عظمت بن گیا
ندرتیں ہی ندرتیں تھیں اسکی صبح و شام میں
ناگہاں کچھ اس طرح اغیار نے تاکا اسے
جس طرح جس طور سے ممکن ہوا لوٹا اسے
دیدۂ بینا پہ پردے پڑ گئے ادبار کے
بے نیازِ رنگ محفل میرِ محفل ہو گیا،

رفتہ رفتہ زندگی کی قدر و قیمت بڑھ گئی
اپنے مرکز سے کچھ آگے آدمیت بڑھ گئی
کر گئی سارے جہاں کو بامراد و کامیاب
عظمتِ دُنیا نظر آنے لگی زیرِ قدم
سرزمینِ ہند یکسر بن گئی باغِ ارم
وہ فراوانی تھی دولت کی، کہ گھٹتے تھے گہر
جیسے پھولوں کی جوانی، جیسے حسنِ کہکشاں
ہر طرف تھی جلوہ فرما اک بہارِ جاوداں،
ارتقا کی گود میں ممتاز تھی بزمِ مجاز
زندگی کے اور سارے مشغلے بے رنگ تھے
ہر طرف بکھرے ہوئے اسباب صد نیرنگ تھے
گلشنِ ہستی میں تھی اک نو بہار آئی ہوئی
گوشہ گوشہ تھا سوادِ ہند کا بے حد حسیں
فخر کے قابل تھی دُنیا کے لئے یہ سرزمیں،
مسکرانے کے لئے خورشید آتا تھا یہاں
قسمتِ ہندوستاں تھی کامیاب و ارجمند
خستہ حالی کی نظر آتی تھی ہر اک راہ بند،
آدمیت کی شناسائی تجارت سے ہوئی
سربسر اک جنتِ امن و مسرت بن گیا
یعنی سچ مچ مرکزِ انوارِ رحمت بن گیا
مرتبہ اس کا بڑھا میخانۂ اقوام میں،
دیکھتے ہی دیکھتے کر کے رہے اپنا اسے
انقلاب اک اور ہی مرکز پہ لے آیا اسے
نقش دُھندلے ہو گئے سب گرمیِ بازار کے
آہ بیداری کا وہ جذبہ کہ باطل ہو گیا

کارواں پر اک عذابِ سخت نازل ہو گیا
آگئی طوفاں میں کشتی، دور ساحل ہو گیا

جب کھلیں آنکھیں، نہ وہ مے تھی نہ وہ میخانہ تھا
جس جگہ ہندوستاں تھا اب وہاں ویرانہ تھا

ہاں مگر تھی اب بھی گنجایش سنبھلنے کے لئے
وقت اب بھی تھا مصائب سے نکلنے کے لئے

گردشیں تھیں مضطرب پہلو بدلنے کے لئے
ناروا حالات کو یکسر بدلنے کے لئے

آہ لیکن ہند والے تھے اسیرِ ناؤ نوش،
تھا کہاں ان غفلتوں کو ترک کر دینے کا ہوش

یورشِ ادبار سے رفعت گئی عزت گئی،
اک حکومت ہی نہیں شوکت گئی عظمت گئی

عیش کے ساماں گئے، ثروت گئی دولت گئی،
اور ہندوستان سے صنعت گئی حرفت گئی

اپنی سعیِ مستقل سے غیر بازی لے گیا
دے گیا طوقِ غلامی سرفرازی لے گیا

آہ اب ہندوستاں کی حالتِ ابتر نہ پوچھ
اب بسر ہوتا ہے دورِ زندگی کیونکر نہ پوچھ

ہیں بلائیں کس قدر چھائی ہوئی سر پر نہ پوچھ
کیا ہوئے وہ لعل و گوہر اور سیم و زر نہ پوچھ

لُٹ چکے ہیں اور لٹنے کے لئے تیار ہیں
سچ تو یہ ہے زندگی سے اپنی بیزار ہیں

رکھ دیا ہے بادۂ عشرت کا ساغر توڑ کر
اور اب اطمینان سے بیٹھے ہیں سب منہ موڑ کر

خوب ہی پایا صلہ غیروں سے رشتہ جوڑ کر
دیکھتے ہیں اپنی بربادی تجارت چھوڑ کر

ولولے باقی نہیں اب، روح تابندہ نہیں
تم انھیں زندہ سمجھ لو ورنہ یہ زندہ نہیں،

وہ تجارت تھی کہ جس نے کر دیا تھا سرفراز
ہر قدم پر منکشف ہوتی تھی اک دنیائے راز

ہند والے ہو گئے جب خود ہی اس سے بے نیاز
ان کو کیا حق ہے کہ ہوں غیروں سے وہ شکوہ طراز

اب یہ حالت ہے بڑھاتے ہیں جدھر اپنا قدم
کچھ نظر آتا نہیں ان کو بجز رنج و الم

دیکھ اے آنکھوں کے اندھے اپنا انجامِ حزیں
تجھ سے بدتر آج کوئی قوم دنیا میں نہیں

اے مسلماں غور فرما یوں بھی جیتے ہیں کہیں
تیری قسمت میں نہیں ہے آج اک نانِ جویں

کیا کبھی دیکھا ہے تو نے اپنے ہم قوموں کا حال
جو خرابِ زندگی ہیں اور فاقوں سے نڈھال

ہائے یہ بیچارگی اب اہلِ ہندوستان کی
آہ یہ انسان سے بیزاریاں انسان کی

ہے کہاں پیشِ نظر تعلیم اب قرآن کی
کیا کوئی تردید کر سکتا ہے اس اعلان کی

"اس زمانے کے مسلماں دشمنِ اسلام ہیں
کامیابی قسمتِ دنیا ہے، یہ ناکام ہیں"

یہ نویدِ جانفزا اور یہ جمودِ بیکسی،،
یہ صلائے کامرانی اور یہ بیچارگی،

ہو رہا ہے ذرّے ذرّے سے ظہور ترگی،
اے مسلماں زندگی ہے یہ بھی کوئی زندگی

جاگنا ممکن ہے اب بھی، جاگ اور انساں بن
ہے اگر مردِ مسلماں صاحبِ ایماں بن

دیدۂ دل کھول، رنگِ عالمِ ایجاد دیکھ
ہے عمل زندہ جہاں، ذرّوں کو بھی آباد دیکھ
ڈال اک گہری نظر "جاپان" کے حالات پر
یہ تجارت ہے کہ جس پر مفتخر جاپان ہے
عزت و عظمت کا گر دل میں ترے ارمان ہے
اور پھر جس نے تجارت کی بنا ڈالی یہاں
فرق اتنا ہے وہ مصروفِ عمل، تو ہے خموش
وہ مفکر اور تو ہے بے نیازِ عقل و ہوش
کاش تو پھر لوٹ آئے اپنی منزل کی طرف
ہے تجارت ہی تری بربادیوں کا اک علاج،
فیصلہ یہ ہے کہ تو تاجر اگر بن جائے آج،
ہے ضرورت سعیٔ پیہم اور استقلال کی
صنعت و حرفت کا تو دلدادہ ہو جائے اگر
روح کو تیری جگانے آئیں انوارِ سحر
زندگی تیری سنور جائے سنورنے کی طرح
بزمِ عالم میں اسی کی عزت و توقیر ہے
صرف تاجر بن کے جو آسودۂ تدبیر ہے
علم کیا تجھ کو نہیں اس حالتِ برباد کا؟
تا بہ کے قیدِ غلامی تا بہ کے یہ بے حسی
عزمِ راسخ کر، بڑھا آگے قدم اور بن جری،
خود فنا ہو جائیں گی تاریکیاں آلام کی،
عہد کر اس کا کہ پھر بننا ہے اب تاجر تجھے
اب نہ رہنا چاہئے اس سعی میں قاصر تجھے
منتظر ہے وقت تیری قدر و عظمت کے لئے

ہے تجارت ہی سکونِ خاطرِ ناشاد دیکھ
صنعت و حرفت کی ہے کتنی حسیں بنیاد دیکھ
ہے وہاں دن کے اُجالوں کی حکومت رات پر
دیکھ کر جس کی ترقی کو جہاں حیران ہے
بے دھڑک میداں میں آ، تو بھی تو اک انسان ہے
وہ فقط تو ہے نہ اسکو بھول لے، ننگِ جہاں
وہ تجارت کا فدائی تو ہے محوِ نا و نوش
کاش پیدا ہو ترقی کا ترے دل میں بھی جوش
تجھکو لے آئے تری تقدیر ساحل کی طرف
اپنی حالت کو بدلنے کے لئے کر احتجاج
کل ترے سر پر نظر آنے لگے عظمت کا تاج
گردشیں ہوں دور تیری قسمتِ پامال کی
کوششیں تیری نظر آئیں یقیناً بارور
کامیابی ہو شعاعِ مہر بنکر جلوہ گر
منزلِ ہستی سے تو گزرے گزرنے کی طرح
زندگی جس کی عمل کی دلنشیں تصویر ہے
اک وہی انساں، وہی اک صاحبِ تقدیر ہے
کیا تجھے بالکل نہیں احساس اس اُفتاد کا!
تو پڑا سوتا ہے دُنیا فایزِ منزل ہوئی
تو ذرا تاجر تو بن ہو جائے گی دُنیا تری
ہوں گی قدرت کی طرف سے بارشیں انعام کی
اک نئے انداز سے ہونا ہے پھر ظاہر تجھے
یہ بشارت دے رہا ہے آج پھر "شاعر" تجھے
کر تجارت، وقف ہو جا تو تجارت کے لئے

نبی احمد بریلوی

زندگی اور موت کے دوراہے پر

کس قدر صبر آزما ہے یہ فریبِ روزگار!
لالہ و گل مسکراتے ہیں کہ روتی ہے بہار!

ذرہ ذرہ میری دُنیا کا ہے حرفِ اضطراب
کھیل ہے میری نگاہوں میں یہ بیداری کا خواب!

منتشر ہونے کو ہیں اجزائے ہستی اے ندیم!
غنچۂ نورس میں لرزاں ہے غمِ روحِ شمیم

برق کی تنویر میں ہوتی ہے تعمیرِ چمن!
یہ ہوا کے تیز جھونکے، یہ چراغِ انجمن!

اُف! کوئی جی کھول کر نالہ بھی کر سکتا نہیں
ہر نفس مرتا ہوں پھر بھی آہ کر سکتا نہیں

سعی بے حاصل ہے فردوسِ مسرت کی تلاش
بے صدا ہے آج سازِ زندگی کا ارتعاش

موت سے اُمید ہے کاوش وہ دن بھی آئیں گے!
جب مرا منھ دیکھ کر اہلِ جہاں رہ جائیں گے!

کاوش حیدرآبادی

اشتہار از محکمہ عدالت منصفی تعلقہ سرپور ضلع آصف آباد

واقع مہر ۱۳۴۹ ف

نمبر مقدمہ ۱/۴۲ سنہ ۱۳۴۹ ف

باجلاس مولوی حفیظ الکبیر خاں ایچ-سی-ایس منصف سرپور

پتی پیلیا معہ تاتا قوم بقال عمر ۴۰ سال پیشہ بیوپار ساکن سرپور ------- مدعی

بنام - ۱- بورم پوشٹی معہ رامیا قوم دھنگر پیشہ ذاتی ساکن بھوپال پٹن تعلقہ سرپور
۲- چیلہ پلیا معہ ارجنا قوم دھنگر عمر ۵۰ سال پیشہ ذاتی ساکن بھوپال پٹن تعلقہ سرپور حال مقام لدلی علاقہ امیری } مدعا علیہم

دعوٰے زر نقد (لـعہ) روپیہ سکہ ع

بنام چیلہ پلیا معہ ایضاً قوم دھنگر عمر ۵۰ سال پیشہ ذاتی ساکن بھوپال پٹن تعلقہ سرپور حال مقام لدلی علاقہ امیری -

ہرگاہ مقدمہ صدر میں تمہارے نام متعدد مرتبہ متعدد مقام پر سمن جاری کئے گئے لیکن تمہارا پتہ نہ چلنے سے سمن بلا تعمیل وصول ہورہے ہیں جس کی وجہ سے منجانب مدعی اشتہار جاری کرنے کی استدعا کیگئی لہذا ذریعہ اشتہار ہذا تم کو اطلاع دیجاتی ہے کہ تم اصالتاً یا وکالتاً بتاریخ ۲۰ آبان سنہ ۱۳۴۹ ف مطابق ۲۵ ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء یوم چہارشنبہ بوقت (۱۰) ساعت حاضر عدالت ہو کر جواب دہی پیروی مقدمہ کرو، بصورت غیر حاضری تمہارے حسب ضابطہ کارروائی کی جائے گی پھر کوئی عذر مسموع نہ ہوگا۔

دستخط سررشتہ دار عدالت

دی مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قایم کی ہوئی واحد جہازران کمپنی

خاص حج سروس

تھوڑے تھوڑے وقفے سے بمبئی و کراچی سے جدہ کو جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام نئی وضع کے سات جہازوں کا شاندار بیڑہ، جس میں جہازوں کا سرتاج ایس ایس "اسلامی" (وزن ۵۸۷۹ ٹن) بھی شامل ہے۔ گزشتہ موسم حج میں جبکہ جنگ کی وجہ سے جہازرانی کے مصارف بہت زیادہ بڑھ گئے تھے مغل لائن نے نہ تو حاجیوں سے زیادہ کرایہ لیا نہ حج سروس بند کی۔

بمبئی اور کراچی سے عدن - جدہ اور بحر احمر کی بندرگاہوں نیز پورٹ لوئی اور ماریشیس تک مسافر اور باربرداری کی سروسیں

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جاسکتی ہیں۔

تفصیلات کے لئے خط و کتابت کیجئے:-

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶- بنک اسٹریٹ بمبئی